Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1961ء

ارشاد خداوندی

یا یھاالذین آمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤ کم - وان تسئلوا عنھا حین ینزل القرآن تبد لکم - عفا اللہ عنھا - واللہ غفور حلیم - (۵/۱۰۱) -

مسلمانوں ! (اپنی طرف سے کاوشیں کرکے) ان چیزوں کی نسبت سوالات نہ کرو کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں بری لگیں - اگر ان چیزوں کی نسبت سوال کروگے جبکہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو (ظاہر ہے کہ) تم پر ظاہر کردی جائینگی (لیکن اس کا نتیجہ خود تمہارے لئے اچھا نہ ہوگا - اور اب تو) خدا نے یہ بات معاف کردی (لیکن آئندہ احتیاط کرو) اور اللہ بخشنے والا اور (انسانوں کی خطاؤں کے لئے) بہت ہی بردبار ہے -

تشریح نبوی ؐ

ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعو ھا - وحرم حرمات فلا تنتھکو ھا - وحد حدودا فلا تعتدو ھا - و سکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثو ھا -

اللہ نے کچھ فرائض تم پر عائد کئے ہیں ، انہیں ضائع نہ کرو - کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ، ان کے پاس نہ پھٹکو - کچھ حدود مقرر کی ہیں ، ان سے تجاوز نہ کرو - اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے ، بغیر اس کے کہ اس سے بھول لا حق ہوئی ہو ، لہذا ان کی کھوج نہ لگاؤ -

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ - بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک
ہندوپاکستان سے سالانہ۔ آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ۔ ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوپاکستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۷۵۰۰
خط وکتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گل برگ۔ لاہور

جلد ۱۴ — ستمبر ۱۹۶۱ء — نمبر ۹

فہرست مضامین

لمعات		۲
بقیہ لمعات		۷
مغربی افریقہ عہد اسلامی میں	(محترم شروت خاں صاحب)	۹
دین و دانش را غلام ارزاں دہد		۲۰
ایک لفظ کے معنی بدل جانے سے		۲۷
الہام اور نبوت		۳۴
صدر پاکستان کی حقیقت کشا تشریح		۴۲
باب المراسلات	(عائلی قوانین)	۴۵
حقائق وعبر	(شیعہ حضرات اور قرآن کریم)	۵۴
نقد ونظر		۵۸
عائلی قوانین کی اسلامی حیثیت	(محترم احمد محی الدین صاحب انصاری)	۶۳
رابطۂ باہمی		۶۸

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

صدر مملکت پاکستان (فیلڈ مارشل محمد ایوب خان) نے، اس تین سال کے عرصہ میں، حکومت کے مختلف شعبوں میں جو کچھ کیا ہے، اس سے قطع نظر، انہوں نے ایک ایسی اہم حقیقت کو قوم کے سامنے پیش کیا ہے، جو "دین اور دنیا" دونوں میں اہل دنیا دکی حیثیت رکھتی ہے او جسے نظر انداز کر دینے سے ہم کارزارِ حیات میں اس قدر پیچھے رہ چکے ہیں۔ وہ اہم حقیقت یہ ہے کہ

> زندگی کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور ان اصولوں کو عمل میں لانے کے لئے جو طریق اختیار کئے جاتے ہیں وہ وقت کے تقاضے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ لہذا، زندگی عبارت ہے ثبات و تغیر کے امتزاج سے۔

انہیں اس حقیقت کی محکمیت پر اس قدر پختہ یقین ہے کہ وہ اسے تین سال سے برابر دُہرائے جا رہے ہیں ——— پبلک جلسوں میں - نجی گفتگوؤں میں - افسروں سے خطاب میں - اپنے طوفانی دوروں کی تقریروں میں - حریم کعبہ میں - ازہر کی یونیورسٹی میں - انگلستان کے دیوان میں، امریکی حکومت کے ایوان میں ——— غرضیکہ کوئی موقعہ ایسا نہیں گذرا جس میں انہوں نے اس حقیقت کو پیش نہ کیا ہو اور کوئی تقریب ایسی سامنے نہیں آئی جس میں انہوں نے اسے نہ دہرایا ہو۔ حتیٰ کہ، پچھلے دنوں کراچی میں، جب ایک غیر مسلم (عیسائی اسقف) نے 'اپنے اسکول کی تقریب میں' اپنے طور پر ایسی بات کہی جو اس اصول کے خلاف جاتی تھی، تو صدر مملکت وہاں بھی اس حقیقت کے پیش کرنے سے نہیں چوکے اور رسمی خطابت سے الگ ہٹ کر، برملا کہہ دیا کہ روایات کا احترام مسلّم، لیکن وہ ابدی طور پر غیر متبدل نہیں سمجھی جا سکتیں۔ ان میں، زمانے کے تقاضوں کے ساتھ، تبدیلی ہوتی رہے گی۔[1]

---

[1] صدر مملکت کی یہ تقریر اسی اشاعت میں الگ شائع کی جا رہی ہے۔

زندگی کی یہ وہ اہم حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے پیش کیا اور جس پر عمل پیرا ہونے سے قرون اول کے مسلمان دیکھتے ہی دیکھتے ایک دنیا پر چھا گئے۔ اس کے بعد یہ حقیقت ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی، تو ہم قعرِ مذلت میں جا گرے۔ علامہ اقبالؒ نے آج سے تیس پینتیس سال پہلے، اس حقیقت کو نہایت اُجلے اور نکھرے انداز میں قوم کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ یورپ کی تباہی کا راز اس میں ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی غیر متبدل اُصول نہیں رکھا، اور ہماری بربادی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ہر بات کو غیر متبدل سمجھ لیا۔ اس سے ہم پر ایسا جمود طاری ہوا کہ ہمارا جسدِ ملت یکسر مفلوج ہو کر رہ گیا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد، ہمارے تعلیم یافتہ (بلکہ یوں کہئے کہ برسرِ اقتدار) طبقہ میں ایک عنصر ایسا تھا جو مغرب کے نظریۂ زندگی سے متاثر تھا اور اس لئے یہاں سیکولر انداز کی حکومت قائم کرنے کا آرزومند۔ سیکولر حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ کسی اصول یا قانون کو غیر متبدل نہ سمجھا جائے۔ دوسری طرف ہمارا قدامت پرست طبقہ تھا۔ جو تغیر کے تصور تک کو کفر و الحاد قرار دے رہا تھا۔ پاکستان کی کشتی، افراط و تفریط کے اس مد و جزر میں بوقتِ اضطراب رہی۔ عسکری انقلاب کے بعد، بعض حساس قلوب کو اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کشتی کا رُخ کہیں سیکولرازم کی طرف نہ مڑ جائے، لیکن صدر مملکت کے پے در پے اعلانات نے اس خدشہ کا ازالہ کر دیا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ اس کشتی کا رُخ، لندن یا ماسکو کی سمت نہیں۔ جانبِ کعبہ ہے۔

"ثبات و تغیر کے امتزاج" کا اصول وہ ہے جس پر تمام نظامِ کائنات کا دار و مدار ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ غیر متبدل اصولوں کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہے لیکن، اس کے ساتھ، ان میں ہر آن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ زمین کی کشش ثقل اور حرکت دوری اور محوری کا اصول پہلے دن سے آج تک غیر متبدل چلا آ رہا ہے لیکن آج کی زمین اور پچاس ہزار سال پہلے کی زمین میں، زمین آسمان کا فرق ہے۔ جہاں اب صحرا ہے وہاں کبھی سمندر تھا۔ جہاں سمندر ہے وہاں پہاڑ تھے۔ جہاں اب برودت ہے وہاں کبھی سخت حرارت تھی۔ جہاں اب لہلہاتی کھیتیاں ہیں وہاں آتش فشاں پہاڑ تھے۔ آج کی زمین دوز کانیں، کبھی سطحِ ارض تھیں۔ انہی تغیرات کا نتیجہ ہے کہ یہ مہیب آتشیں گولہ، زندگی کا گہوارہ بن گیا۔ اگر یہ کرّہ ان تغیرات سے ناآشنا رہتا تو اس میں کوئی سانس لینے والا تو ایک طرف، سبز پتہ تک دکھائی نہ دیتا۔ اور اگر اس کا بنیادی اُصول غیر متبدل نہ ہوتا تو یہ کبھی کی نسیاً منسیا ہو چکی ہوتی۔

زمین پر زندگی کی نمود ہوئی تو اس کے لئے بقائے اصلح کا غیر متبدل اصول مقرر کر دیا گیا—یعنی زندہ وہی رہے گا جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو گی۔ آگے وہی بڑھے گا جو آگے بڑھنے کی استعداد

پیدا کرے گا۔ محفوظ وہی رہے گا جو خطرات کا مقابلہ کرنے کی قوت رکھے گا۔ لیکن یہ قوت اور استعداد اس میں پیدا ہو سکے گی جو اپنے آپ کو ماحول کے مطابق بناتا رہے گا۔ یعنی بقائے اصلح (Survival Of The Fittest) کے اصول کے ساتھ ماحول سے موافقت (Adaptability to Environment) کا قانون لاینفک ہے۔ چنانچہ جس نوع (Species) نے زمین کے تغیرات کے ساتھ اپنے آپ کو بدل لیا' وہ باقی رہی اور آگے بڑھی۔ جس نے تبدیلی سے انکار کیا' وہ ختم ہو گئی یا وہیں کی وہیں رُکی رہ گئی۔

خارجی کائنات سے ہٹ کر آپ انسانی زندگی پر غور کیجئے۔ وہاں بھی ثبات و تغیر کا یہی ابدی اصول کارفرما ملے گا۔ ایک فرد کی زندگی کا' بچپن سے آخری عمر تک' مطالعہ کیجئے۔ اس میں ایک شے ایسی ملے گی جو شروع سے اخیر تک غیر متبدل رہتی ہے۔۔۔ وہ شے جسے "میں" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن' اس کے علاوہ' انسانی جسم میں ہر آن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔۔۔ ایسی تبدیلیاں کہ آپ جوانی میں پہنچ کر' اپنی بچپن کی تصویر کو خود بھی نہیں پہچان سکتے۔ اگر انسانی جسم کی ان تبدیلیوں کو روک دیا جائے تو اول تو اس فرد کی موت واقع ہو جائے گی۔ ورنہ اس کی نشو و نما' چینی عورتوں کے پاؤں کی طرح (جواب غالباً قصۂ پارینہ بن چکے ہیں) ٹھٹھر کر رہ جائے گی۔ یعنی اگر اس میں غیر متبدل "میں" نہ رہے تو یہ انسان سے' حیوان بن جائے۔ اور اگر اس میں تبدیلیوں کا سلسلہ رُک جائے تو یہ ذی حیات سے پتھر میں تبدیل ہو جائے۔

جو کیفیت ایک فرد کی ہے' وہی حالت قوم کی ہے۔ آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ جن قوموں نے اپنے نظام تہذیب و تمدن کی بنیاد غیر متبدل اصولوں پر نہ رکھی' وہ' لا محدود قوت حاصل کر لینے کے باوجود' تباہ و برباد ہو گئیں اس لئے کہ

> وہ نظام تہذیب' جس میں حق و صداقت کے (ابدی اصول) کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو' آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے..... انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ خواہ اس کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے (باطل اصولوں سے مراد یہ ہے کہ' بنابر مصلحت' جو راستہ بھی چاہے اختیار کر لیا جائے)۔ اس کی بنیادی کمزوری' خارجی نظم و ضبط اور ادھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لیئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت' عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس "سوداگری" کو نہایت قابلیت

اور تدبر، خلوص اور دیانت سے چلایا۔ لیکن حسن انتظام کی یہ تمام خوبیاں، بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔

(BRIFFAULT)

دوسری طرف وہ قومیں بھی تباہ و برباد ہو گئیں جو کسی ایک مقام پر کھڑی ہو گئیں اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے، آگے نہ بڑھیں۔ افریقہ کے حبشی — آسٹریلیا کے قدیم باشندے۔ امریکہ کے نیگرو۔ قطب شمالی کے اسکیمو کیا ہیں؟ انہی اقوام کے جامد و غیر متحرک مجسمے جنہوں نے اپنے مقام سے ہلنا پسند نہ کیا۔ جنہوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دیا۔ جنہوں نے ماحول سے مطابقت، کے فطری اصول کو ٹھکرا دیا۔ ان کی جھونپڑیاں اور کھالیں۔ ان کے تیر کمان اور بھالے۔ ان کے خورونوش کے انداز اور رہنے سہنے کے طور طریقے۔ حتیٰ کہ ان کے نظریات و معتقدات اور رسوم و رواج، سب ان مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں وہ رُک کر کھڑے ہو گئے اور جہاں سے ان کے ہم عصر قبائل اور اقوام آگے بڑھ گئیں۔ ان کے متعلق شاید سطح بین نگاہیں یہ کہہ دیں، کہ انہوں نے کبھی ترقی ہی نہیں کی تھی۔ لیکن مصر اور یونان۔ عراق اور ہندوستان۔ (سابقہ) چین اور ترکستان کی اقوام کے متعلق کیا کہیں گے جن کی سطوت و ثروت کی داستانیں زمانے کی چٹانوں پر منقوش ہیں لیکن لحد کی حالت، ان کے زمانۂ ثروت کی بھیانک قبروں کے سوا کچھ نہیں۔ انکی یہ حالت کیوں ہو گئی؟ اس لئے کہ وہ ایک مقام پر رک گئیں۔ آگے نہ بڑھیں۔ انہوں نے تبدیلی، کے فطری قانون سے آنکھیں بند کر لیں۔ یاد رکھئے "فلسفہ معاشرت کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ کوئی مکمل شے بھی جمود کی حالت میں مکمل نہیں رہ سکتی۔ یہ اصول تمام اشیائے فطرت کی جڑوں میں کارفرما ہے۔ انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ آگے بڑھو یا پیچھے ہٹو۔ ایک مقام پر کھڑے رہنا روح کائنات سے جنگ کرنا ہے۔ جو آگے نہیں بڑھ رہا، سمجھ لیجئے کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے۔ زندگی کے فرسودہ پیکروں کو گلے سے لگائے رکھنا" تنزل و تسفل ہے۔ ایسی زندگی دن تو پورے کر لیتی ہے لیکن کبھی پھل نہیں لا سکتی۔" قرآن کریم نے ایسی زندگی کو "جحیم" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اور "جحیم" اس مقام کو کہتے ہیں جہاں کوئی رُک کر کھڑا ہو جائے۔ اس کے برعکس جنت کی زندگی ہے جہاں "نہریں بہتی ہیں۔" کسی مقام پر رُکا ہوا پانی نہیں ہے جس میں سڑاند پیدا ہو جاتی ہے۔ ان اقوام کے لئے "پس ماندہ" کی اصطلاح پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ان کا جرم کیا تھا؟ یہی کہ وہ زمانے کا ساتھ دیتی ہوئی آگے نہ بڑھیں، پیچھے رہ گئیں — اور زمانہ انہیں روندتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ زمانے کا ریلا تو اتنی بھی مہلت نہیں دیتا کہ کوئی راہرو پاؤں سے کانٹا

نکالنے کے لئے کہیں بیٹھ جائے۔ جو بیٹھا وہ کچلا گیا۔ جو رُکا وہ پکڑا گیا ــــ اس لئے کہ جہاں باز و سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے۔

یہ رُکنا اور بیٹھ جانا، ناپختگیٔ ذہن و کردار کی نشانی ہے۔ آپ بچے کی کیفیت کا مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بنائے ہوئے نقشوں میں ذرا سی بھی تبدیلی کر دی جائے تو وہ رونے لگ جاتا ہے۔ وہ انہی مقامات میں گھومتا پھرتا ہے جن سے وہ مانوس ہو ــــ نامانوس مقامات میں جانے سے ڈر لگتا ہے۔ جب انسانی ذہن اپنے بچپن کے زمانے میں تھا، تو اس نے اپنے لئے جو "مذہب" وضع کیا، وہ بھی اس کی اسی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ جادو کے فارمولے۔ منتروں کے اشلوک۔ ورد و وظائف کے الفاظ۔ چلّوں اور مراقبوں کے انداز و اسلوب۔ مذہبی رسوم و آداب کی شکل و صورت۔ اِن سب کو بعینہٖ انہی پیکروں میں رکھنا ضروری تھا جن میں وہ اسلاف سے چلے آتے تھے۔ ان میں ذرا سی تبدیلی کے تصور سے اس کی روح کانپ اٹھتی۔ وہ ڈرنے اور لرزنے لگ جاتا تھا۔ اس لئے قدیم الایام کا ذہن انسانی کا تراشیدہ مذہبی تصور، انسانی آزادی کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتا تھا۔ وہ انسانی اعمال کے لئے ہی نہیں بلکہ انسانی جذبات تک کے لئے جامد، متصلب اور ناقابلِ تغیر قوانین متعین کرتا تھا۔ اس سے انسانی زندگی ایک مستقل بوجھ کے نیچے دبی رہتی تھی۔ قرآن نے آکر ان غیر فطری بوجھوں کو اتارا اور انسانوں کی خود ساختہ زنجیروں کو توڑا۔ اس نے کچھ غیر متبدل حدود مقرر کر دیئے اور ان حدود کے اندر، انسان کو فکر و عمل کی آزادی دیدی کہ وہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق، اپنے لئے مناسب راستے خود تجویز کرلے۔

قرآن کے اس انقلابی تصور کے مدمقابل وہ ذہنیت تھی جس کا ابھی ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ ذہنیت کہ جو کچھ ہمارے ہاں اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں تصورات کا ٹکراؤ ہے جس کی طرف قرآن کریم یہ کہہ کر توجہ دلاتا ہے کہ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۲/۱۷۰)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو ضابطہ ہدایت خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم اس کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے۔" یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ ان کے اسلاف سے چلا آرہا تھا، وہ سب کا سب بالضرور باطل نہیں تھا۔ اس میں ایسی باتیں بھی تھیں جنہیں اختیار کئے رکھنے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ چنانچہ ان میں سے کئی باتیں خود رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہ رہنے دیں ــــ مثلاً ختنہ۔ عقیقہ۔ ولیمہ وغیرہ۔ حتیٰ کہ بعض باتوں کو خود وحی نے بھی اسی طرح رہنے دیا۔ مثلاً حج کے بعض مناسک

یا حلال و حرام اور رشتوں ناطوں کے اکثر ضوابط ـــــ اس سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے ہاں جو کچھ اسلاف سے چلا آرہا تھا، تمام کا تمام باطل نہیں تھا جو یہ کہا گیا کہ تم ان کے اتباع پر کیوں مُصر ہو۔ ایسا کہنے سے اصل مقصد اس تصور کا ابطال تھا جس کی رُو سے سمجھا جاتا تھا کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہو اُسے چھوا نہیں جا سکتا۔ چونکہ یہ تصور یا عقیدہ انسانی ارتقاء کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل تھا اس لئے قرآن کریم نے اس کی اس شدت سے مخالفت کی اور جب ان کے ذہن سے اس عقیدہ کو نکال دیا تو ان کے اسلاف کی کئی ایک باتوں کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا۔ اب ان باتوں کا اختیار کرنا اس لئے نہیں تھا کہ وہ اسلاف سے چلی آرہی تھیں، بلکہ اس لئے تھا کہ وہ دین کے اصولوں کے خلاف نہیں تھیں اور معاشرہ کے لئے مفید تھیں۔

لیکن جب قرآن کریم کی تعلیم ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی تو ہم میں ایک ایک کرکے وہ تصورات آگئے جنہیں مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ انہی میں یہ تصور بھی تھا کہ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا غیر متبدل ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے ہمارے ہاں بھی وہی نتائج مرتب ہوئے جو سابقہ مذاہب میں پیدا ہوئے تھے۔ راشڈل، اس ضمن میں عیسائیت پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

> قدم قدم پر لگے بندھے قاعدوں اور ضابطوں سے نہ صرف انسانی تشخص اور قوت تخلیق ہی تباہ ہو جاتی ہے بلکہ اس سے جو اخلاقی اثر مرتب ہوتا ہے وہ بھی درحقیقت اخلاقی سعی و عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ وہ زندگی جس میں کوئی جاذبیت نہ ہو۔ یا یوں کہیئے کہ جس میں فطری جاذبیتوں کی جگہ وہ مصنوعی جاذبیتیں لے لیں جو زندگی کے غیر فطری حالات سے پیدا کی گئی ہوں، اور اس میں عمق قلب سے ابھر کر آنے والے جذبۂ عمل کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو، اخلاقی نشوونما کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ خانقاہیت کی تاریخ میں بہت سا ایسا مسالہ مل جاتا ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی کو کڑے قواعد و ضوابط کی زنجیروں میں جکڑ دینے سے انسان کی طبیعت میں ایک قسم کا طفلانہ پن آجاتا ہے اور اس سے معاشرہ سے نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔
>
> یہ نہیں کہ اس قسم کے جذبات صرف اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کسی کو اس قسم کی پابندی پر مجبور کیا جائے۔ بلکہ اُس وقت بھی (پیدا ہوتے ہیں) جب یہ پابندیاں بطیب خاطر اختیار کی جائیں۔ اس قسم کی "پولیس ڈسپلن" سے انسانی سیرت میں بڑا گھناؤنا تنزل پیدا ہو جاتا ہے۔ تعمیر سیرت اختیاری اعمال سے ہوتی ہے اس لئے جہاں انسان کے لئے اختیار

وانتخاب کا کوئی موقع ہی نہ ہو، وہاں کیا سیرت مرتب ہوگی؟

یہی وہ حقیقت ہے جس کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے کہ

> قدامت پسندی مذہب کی دنیا میں بھی اسی طرح بُری ہے جس طرح انسانی زندگی کے اور شعبوں میں۔ اس سے انسانی انا کی قوتِ تخلیق تباہ ہو جاتی ہے اور نئے نئے روحانی تجارب کا راستہ مسدود ہو جاتا ہے۔ (خطبات صفحہ ۱۷۳)

مذہب میں قدامت پرستی کے معنی یہ ہیں کہ مذہب سے متعلق کسی بات کو قابلِ تغیر و تبدل نہ سمجھا جائے اور جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اسے چھونے تک کی اجازت نہ دی جائے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اگر اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنا جائز قرار دیا جائے تو اس سے اسلاف کی توہین ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر غیر مذاہب والے ہم پر اعتراض کریں کہ یہ کہاں کی دیانت ہے کہ آپ "مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا" سے ہمارے اسلاف کی تو بار بار توہین کرتے رہیں، اور اپنے ہاں اس اصول کا اطلاق نہ کریں کیونکہ اس سے آپ کے اسلاف کی توہین ہوتی ہے، تو ہمارے پاس اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ "مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا" سے کسی کے اسلاف کی توہین نہیں ہوتی۔ اس سے صرف یہ کہنا مقصود ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا تھا، اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کیا تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں، اس لئے اب اُنہی کے فیصلوں پر جمے رہنا، زندگی کو مقید کر دینا ہے۔ یہ اصول غلط ہے — خواہ تمہارے ہاں ہو یا ہمارے ہاں۔

اور یہی وہ حقیقت ہے جس کے پیش نظر صدر مملکت پاکستان، بار بار اعلان کرتے ہیں کہ زندگی کے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں لیکن وہ پیکر غیر متبدل نہیں ہوتے جن میں ان اصولوں کو مختلف زمانوں میں نافذ العمل کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اصول، انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہوتے۔ خدا کے تجویز فرمودہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان کے بروئے کار لانے کے طور طریقے انسانوں کے تجویز کردہ ہوتے ہیں جن میں زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ اسی حقیقت کو انہوں نے اب کراچی کی سیرت النبیؐ کے جلسہ میں اپنی تقریر میں پیش کیا ہے۔

اس مقام پر ایک اہم نکتہ کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ "اصول غیر متبدل ہوتے ہیں" تو اس سے کون سے اصول مراد ہیں؛ دنیا میں وقتاً فوقتاً مختلف تحریکیں اٹھتی رہی ہیں جن میں کہا جاتا رہا ہے کہ چند غیر متبدل اصولوں کا ضابطہ مرتب کر لیا جائے اور اسی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ کہیں ان اصولوں کو "قوانین فطرت" کا مبہم نام دیا گیا۔ کہیں انہیں "انسانی حقوق" کی (بقیہ صفحہ پر دیکھئے)

مغربی افریقہ عہدِ اسلامی میں

(قسط دوم)

اسکیائے اعظم (۱۴۹۲ - ۱۵۲۸)

مالی کے زوال کے بعد پندرھویں صدی میں قبیلہ سونگھائی کو عروج ہوا۔ اس قبیلے کا مرکز، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے گاؤ کا شہر تھا۔ یہ جگہ دریائے نائجر کے کنارہ ٹمبکٹو اور موجودہ جمہوریہ نائجر کے دارالحکومت نیامی (NIAMI) کے درمیان موجودہ جمہوریہ مالی کے حدود میں، واقع ہے۔ چودھویں، پندرھویں اور سولھویں صدی میں گاؤ مغربی سوڈان کے سب سے بڑے شہروں میں سے تھا۔ عربی تاریخوں میں یہ جگہ کوکو کے نام سے پائی جاتی ہے جو اس کے دوسرے نام گوگو (GOGO) کی معرب شکل ہے۔

گاؤ نے منسا موسیٰ کی موت کے بعد ہی آزادی حاصل کر لی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ منسا موسیٰ کے زمانہ میں جب یہ شہر فتح ہوا تو منسا موسیٰ یہاں کے دو شہزادوں، علی کولین اور سلیمان نار کو اپنے ساتھ بطور یرغمال لے گیا تھا۔ منسا موسیٰ کے جانشین نے ان کو نقل و حرکت کی اجازت دیدی تھی، جس سے انہوں نے فائدہ اٹھایا، اور موقع پاکر فرار ہو گئے، اور گاؤ پہنچ کر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۱۳۳۵ء سے جبکہ علی کولین نے آزادی حاصل کی ۱۴۹۲ء تک اس خاندان میں کل انیس حکمران ہوئے۔ سو سال تک تو گاؤ کے حکمران خود کو مالی کے حملوں سے بچاتے رہے۔ اس کے بعد ان میں ایک طاقتور شخصیت ظہور میں آئی جس کا نام سنی علی (۱۴۶۴ - ۱۴۹۲) تھا۔

سنی علی

سنی علی نے ۱۴۶۸ء میں ٹمبکٹو اور ۱۴۷۳ء میں جنّی[1] (Jenne) کا شہر، شہر جو ٹمبکٹو اور رباکو کے درمیان آباد ہے، کئی سال کے محاصرہ کے بعد فتح کر لیا۔

---

[1] یہ شہر دریائے نائجر کی انتہائی زرخیز وادی میں آباد ہے۔ اس کے چاروں طرف جھیلوں، اور دریاؤں کا جال بچھا ہوا ہے۔ جھیلو (باقی صفحہ پر)

سنی علی کی طبیعت میں سختی تھی۔ وہ بہت جلد مغضوب الغضب ہو جاتا تھا۔ اور بعد میں اپنے کئے پر نادم ہوتا تھا۔ ٹمبکٹو کے باشندے خاص طور پر اس کی سختی کا شکار ہوئے۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود وہ بڑی صلاحیت کا مالک تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ اپنے ۲۶ سالہ دور حکومت میں ایک وسیع سلطنت قائم کر دی بلکہ اس کی بنیادیں بھی مضبوط کر دیں۔ اس نے ولاتا (ولاطہ) کے شہر کو تین سو میل لمبی نہر کے ذریعہ ناجر کی بڑی جھیل فیگ بائن (Fagbine) سے ملانے کا عظیم منصوبہ تیار کیا تھا تاکہ ولاتا کا شہر سوڈان کے بڑے شہروں سے آبی راستے کے ذریعہ ملا دیا جائے۔ چونکہ مغربی سوڈان کے بیشتر شہر گاؤ، ٹمبکٹو، جنی، سیگو اور موپتی (MOPTI) وغیرہ دریائے ناجر کے کنارے آباد ہیں، اس لئے یہ منصوبہ نہ صرف یہ کہ دور رس معاشی نتائج کا حامل ہوتا' بلکہ سنی علی کی غیر معمولی دانشمندی کا بھی ایک ثبوت ہوتا۔ منصوبہ پر کام شروع ہو چکا تھا۔ لیکن غیر مسلم موسی قبائل کے حملے کی وجہ سے منصوبہ ترک کرنا پڑا۔

اسکیا محمد سنی علی کے بعد اس کا لڑکا تخت پر بیٹھا۔ لیکن اس کا ایک قابل عہدیدار محمد توری، جو سونغے قبیلے سے تھا، تخت پر قابض ہو گیا اور اس طرح سونگھائی کے اس قدیم خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ محمد توری نے اسکیا کا لقب اختیار کیا جس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ تاریخ میں وہ اسکیا محمد اول، یا اسکیائے اعظم کے نام سے مشہور ہے۔

حکومت مستحکم ہونے کے فوراً بعد اسکیہ محمد ۱۴۹۶ء یا ۱۴۹۷ء میں حج کے لئے گیا۔ پانچ سو سوار اور ایک ہزار پیادے اس کے ساتھ تھے۔ علاوہ ازیں سفر خرچ کے لئے سونے کے تین لاکھ سکے بھی ساتھ لے گیا تھا۔ اس میں سے ایک تہائی رقم اس نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کار خیر پر صرف کی۔ واپسی پر سلطان نے مصر میں عباسی خلیفہ متوکل سے ارض سوڈان کی سند حاصل کی۔ اس نے کچھ مدت مشہور عالم جلال الدین سیوطی (۱۴۴۵-۱۵۰۵) کی صحبت میں رہ کر ان سے علم حاصل کرنے پر بھی صرف کی۔

حج سے واپس آ کر اسکیہ محمد نے مغرب اور جنوب کی سمت سلطنت کو توسیع دی اور وہ بیشتر علاقہ فتح کر لیا جو کسی زمانہ میں مالی کی سلطنت میں شامل تھا۔ اس طرح اسکیہ کی سلطنت کی مغربی حدود تقریباً بحر اوقیانوس تک

نٹ نوٹ صفحہ ۱۰ سے آگے۔

کے اس قدرتی حصار کی وجہ سے عہد قدیم میں یہ شہر ناقابل تسخیر بن گیا تھا۔ چنانچہ مالی کی سلطنت بھی ننانوے حملوں کے باوجود جنی کو تسخیر نہ کر سکی تھی۔ مغربی سوڈان میں عہد وسطیٰ میں علوم کے دو سب سے بڑے مرکز تھے ایک ٹمبکٹو اور دوسرا جنی۔ ٹمبکٹو میں علمی سیادت بربروں کو حاصل تھی اور جنی میں مندنگو باشندوں کو۔ سوڈان کے دو بڑے مصنفوں میں احمد بابا ٹمبکٹو کے تھے اور بربر تھے اور عبدالرحمان سعدی جنی کے تھے اور مندنگو تھے۔

پہنچ گئیں۔

اس کے بعد اس نے مشرق کی ہوسا[1] ریاستوں کا رخ کیا جن کی بڑی تعداد اب نائجیریا میں شامل ہے۔ یہاں اس نے گوبیر، کانو، زاریا اور کیٹنا کی ریاستوں کو، جو اس وقت تک غیر مسلم حکمرانوں کے تحت تھیں، فتح کر لیا۔ اس کے بعد اسکیہ محمد نے شمال مشرق کے بربر قبیلہ ترقہ (Tuareg) کی طرف رُخ کیا، جو ہوسا قبائل کی خوش حال بستیوں پر چھاپا مارا کرتے تھے۔ خانہ بدوش بربروں کو صحرا کی طرف بھگا دیا گیا اور تحفظ کے لئے اگادس (Agades) کے سرحدی علاقے میں سونگھائی قبائل کو آباد کر دیا گیا، جو آج تک وہاں موجود ہیں۔

اسکیہ محمد اوّل نے جو سلطنت قائم کی وہ تقریباً اس تمام علاقے پر محیط تھی، جو اب تک فرانسیسی مغربی افریقہ کہلاتا تھا، اور جس کا رقبہ تقریباً اٹھارہ لاکھ مربع میل تھا۔ اگرچہ جنوب کے ساحلی علاقے گولڈ کوسٹ، آئوری کوسٹ، اور گنی اس کی سلطنت میں شامل نہیں تھے۔ لیکن تمام شمالی نائجیریا اور وہ بیشتر صحرائی علاقہ جو آجکل نائجیریا کہلاتا ہے، اس کی حدود سلطنت میں شامل تھا۔

اسکیہ محمد صرف ایک بڑا فاتح ہی نہیں تھا بلکہ ایک عظیم منتظم اور مدبر حکمران بھی تھا۔ اس نے حکومت میں پہلی مرتبہ سیاسی، انتظامی، اور فوجی[2] محکمے قائم کئے۔ مملکت کو صوبوں میں تقسیم کیا، پولیس قائم کی اور قاضی مقرر کئے۔ مستقل فوج قائم کی گئی، اور دریائے نائجر میں کشتیوں کا بیڑا بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسکیہ پہلا سیاہ فام حکمران ہے جس نے مملکت کی تنظیم اس زمانہ کے جدید ترین اصولوں کے مطابق کی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسکیہ محمد نے سفر حج کے دوران حجاز اور مصر میں حکومتوں کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ بعد میں اپنے ان تجربوں سے اس نے بلاد سودان میں فائدہ اٹھایا۔

حج کا شوق، خلیفہ سے حکومت کا اجازت نامہ حاصل کرنا اور علامہ سیوطی سے تحصیل علم کرنا ایسے امور ہیں جن سے اسکیہ محمد کی اسلام سے شیفتگی ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے اس علم اور تجربے سے مملکت کو پورا فائدہ پہنچایا۔ اس نے بلاد سودان سے ان غیر اسلامی اثرات کو ختم کرنے کے لئے، جو اسلام کے آنے کے

---

[1] نائجیریا کی ہوسا ریاستوں کی تاریخ کے لئے دیکھئے تاریخ نائجیریا (انگریزی) مصنفہ ایلن برنس۔ اس کے علاوہ وہ مقالے بھی دیکھے جائیں جو ان ریاستوں سے متعلق ان کے ناموں کے تحت انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں پائے جاتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مقالے (HAUSA، BORNU، KANO، SOKOTO اور PUL) اس سلسلے میں بڑے پر از معلومات ہیں۔ [2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مقالہ (GOGO)۔

باوجود سودانی باشندوں میں موجود تھے' اور جن کی ابن بطوطہ نے شکایت کی تھی' حتی المقدور کوشش کی۔ اس نے بدعتوں اور مشرکانہ رسوم کی بیخ کنی کی۔ اشاعت اسلام کے لئے کوششیں کیں اور رعایا پر محاصل کا بار ہلکا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا دل وجان سے اس کی فریفتہ ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اہم معاملات میں قاصد بھیج کر امام سیوطی سے مشورہ بھی کیا کرتا تھا۔

اسکیہ محمد چونکہ خود عالم تھا اس لئے اس نے علماء کی دل کھول کر سرپرستی کی اور مغربی سودان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ علماء کو حکومت کے اندر ممتاز ترین مقام حاصل ہوا۔ حسن الوزان فاسی (لیوافریقی) جس نے اس زمانہ میں سودان کا سفر کیا تھا لکھتا ہے:

"اطبا، قاضیوں اور علماء کی کثرت ہے۔ بادشاہ ان کے اخراجات فیاضانہ طریقہ پر اٹھاتا ہے۔ بیرونی علاقوں سے جو کتابیں آتی ہیں وہ سوداگری کے دوسرے سامان کی نسبت زیادہ قیمت پاتی ہیں۔"[1]

اسکیہ محمد نہ صرف یہ کہ بلاد سودان کی تاریخ میں سب سے بڑا حکمران گذرا ہے بلکہ وہ تاریخ کے عظیم حکمرانوں میں سے ایک ہے۔ اس کے معاصرین میں سے، سوائے سلیمان اعظم کے، اور کوئی حکمران عظمت میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مورخین نے اسے بجا طور پر اسکیائے اعظم کہا ہے۔

اسکیائے اعظم نے تقریباً ۳۵ سال نہایت شان وشوکت سے حکومت کی۔ لیکن اس کا انجام بڑا دردناک ہوا۔ آخر زمانہ میں اس کے تین لڑکے باغی ہوگئے۔ بادشاہ نے اپنی مدد کے لئے اپنے بھائی یحییٰ کو بلایا لیکن لڑکوں نے اس کو قتل کردیا اور دارالحکومت گاؤ میں داخل ہوکر اسکیہ محمد کو بڑے لڑکے موسیٰ کے حق میں دست بردار ہونے پر مجبور کردیا۔ یہ واقعہ ۱۵۲۸ء کا ہے۔ بعد میں رعایا نے موسیٰ کو اس کے مظالم کی وجہ سے قتل کردیا۔ موسیٰ کے جانشین نے بوڑھے اسکیہ کو محل سے نکال کر، جہاں موسیٰ نے رہنے کی اجازت دے رکھی تھی دریائے نائجر کے ایک جزیرہ میں جلاوطن کردیا، جہاں اس کا انتقال ہوگیا۔

اسکیائے اعظم کے بعد، ۱۵۲۸ء سے ۱۵۹۱ء تک، گاؤ میں آٹھ حکمران گذرے لیکن سوائے ایک کے سب نااہل ثابت ہوئے۔ ان میں صرف اسکیہ داؤد (۱۵۴۹ء تا ۱۵۸۳ء) نے زوال کو روکنے کی کوشش کی اور اپنے باپ اسکیائے اعظم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن جب اس کا بیٹا اسحٰق وارث ہوا تو وہ

---

[1] تاریخ مراکش از میکنس ترجمہ مولوی انشاء اللہ خاں۔

اپنے باپ کی پیروی نہ کر سکا۔ اسی دوران میں شمالی سرحد پر جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں وہ اتنی زبردست ثابت ہوئیں کہ خاندان اسکیہ کے اقتدار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ مراکش کے حکمران منصور ذہبی (۱۵۷۸ء تا ۱۶۰۸ء) نے سوڈان کے سونے کے لالچ میں ایک زبردست لشکر جنوب کی طرف روانہ کیا۔ یہ فوج توپوں اور آتشیں اسلحہ سے مسلح تھی۔ اسکیہ اسحاق نے اس فوج کا ٹمبکٹو کے قریب نہایت شجاعت سے مقابلہ کیا، لیکن توپوں اور آتش بار اسلحہ کے سامنے ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔ سوڈانیوں کو شکست ہوئی۔ ۱۵۹۱ء میں ٹمبکٹو اور اس کے بعد دارالحکومت گاؤ فتح کر لئے گئے۔ اور چند ماہ کے اندر اندر پورے سوڈان پر مراکش کا قبضہ ہو گیا۔

گاؤ کے سونگھائی قبیلہ کی خود مختاری کا پورے دو سو چھپن سال (۱۳۳۵ء تا ۱۵۹۱ء) بعد خاتمہ ہوا۔ ایک سو ستاون سال قدیم خاندان نے حکومت کی اور اکانوے سال اسکیہ کے خاندان نے حکومت کی۔

گاؤ کے عروج کا یہ زمانہ مغربی افریقہ کی تاریخ میں کئی لحاظ سے اہم ترین دور ہے۔ مغربی سوڈان میں اس دور میں تجارت کو بڑا فروغ ہوا۔ علم و ادب نے ترقی کی۔ بلکہ بلادِ سوڈان میں علم و ادب کا احیاء اسی زمانہ میں ہوا اور اسلامی تعلیمات کی تجدید ہوئی۔ جس طرح مالی کے عہد عروج کے عام حالات معلوم کرنے کے لئے ابن بطوطہ کا سفرنامہ ہمارا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اسی طرح خوش قسمتی سے، اس زمانہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھی ایک اہم عصر شہادت موجود ہے یہ ہے حسن الوزان فاسی، جو یورپ میں لیو افریقی کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے اسکیائے اعظم کے عہد حکومت میں، ۱۵۰۹ء اور ۱۵۱۳ء میں، دو مرتبہ سوڈان کا سفر کیا تھا۔ بعد میں اس نے اپنے سفر کے حال کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا۔ اس کتاب سے سوڈان کی معاشرت سے متعلق بڑی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اب اسلامی اثرات کے تحت سوڈان کی زندگی میں کتنی مفید تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ وہ ٹمبکٹو کے متعلق لکھتا ہے۔

"یہاں تاجروں اور صنعت کاروں کی بہت سی دکانیں ہیں اور سوتی کپڑا بنا جاتا ہے۔ سوائے ملازم عورتوں کے تمام عورتیں نقاب پہنتی ہیں۔ باشندے، خصوصاً بیرونی باشندے، بہت دولتمند ہیں۔ کنوؤں کی کثرت ہے جن کا پانی نہایت شیریں ہوتا ہے۔ دریا کا پانی نہروں کے ذریعہ شہر میں جگہ جگہ آتا ہے۔ مکئی، مویشی، دودھ اور مکھن کثرت سے ہوتا ہے۔ لیکن نمک کی بڑی کمی ہے۔ ایک اونٹ نمک اسّی دوکات (Doucot) میں فروخت ہوتا ہے۔ باشندے خوش مزاج اور نرم دل ہوتے ہیں۔ رات کا بڑا حصہ سڑکوں پر ناچ گا کر گذارتے ہیں۔ شہر کے باہر باغات بالکل نہیں ہیں۔

ٹمبکٹو کے دولتمند حکمراں (سکیائے اعظم) کے پاس سونے کے بکثرت عصا اور رکابیاں ہیں۔ ان میں بعض عصا کا وزن تیرہ سو پونڈ ہے۔ بادشاہ کا دربار خوب آراستہ اور شاندار ہے۔ جب وہ باہر جاتا ہے تو اونٹ پر جاتا ہے۔ جنگ میں بھی اونٹ پر جاتا ہے باقی سپاہی گھوڑوں پر۔ تین ہزار گھوڑا سوار ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ پیدل اس کے علاوہ ہیں۔ فوج کے پاس زہر میں بجھے تیر رہتے ہیں۔

یہاں گھوڑے بہت کم ہوتے ہیں۔ بہترین گھوڑے باہر سے آتے ہیں۔ بادشاہ تاجروں کو گھوڑوں کی قیمت فیاضانہ ادا کرتا ہے۔

سکہ سونے کا ہوتا ہے جس پر کوئی نشان یا تحریر نہیں ہوتی۔ کم قیمت کے لئے سیپی (Shell) استعمال کی جاتی ہے جو ایک دوکات میں چار سو ملتی ہیں۔"

شہر مالی کے متعلق لکھا ہے کہ

یہاں کی آبادی چھ ہزار سے زیادہ گھروں پر مشتمل ہے۔ باشندے دولتمند ہیں۔ علماء کی کثرت ہے اور وہ مسجدوں میں تعلیم دیتے ہیں۔ یہاں کے باشندے بذلہ سنجی تہذیب اور صنعت میں باقی سودانی باشندوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔

دارالحکومت گاؤ یا کوکو کے متعلق لکھتا ہے:۔

بغیر فصیل کا شہر ہے۔ سوائے بادشاہ اور درباریوں کے باقی لوگوں کے گھر معمولی ہیں۔ تاجر بہت دولتمند ہیں۔ غلاموں کا بازار پایا جاتا ہے۔ شمالی افریقہ اور یورپ کے کپڑے کی مانگ ہے۔ پندرہ سال کا غلام چھ دوکات میں ملتا ہے۔ شاہی حرم میں غلام اور لونڈیوں کی کثرت ہے۔ بادشاہ کی حفاظت کے لئے گھوڑسوار اور پیدل سپاہی ہوتے ہیں۔ جو گھوڑے یورپ میں دس دوکات میں خریدے جاتے ہیں وہ یہاں پھر چالیس سے پچاس دوکات میں فروخت ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یورپ کا گھٹیا سے گھٹیا کپڑا بھی چار دوکات میں آسانی سے بک جاتا ہے۔ تلوار کی قیمت تین یا چار کراؤن ہوتی ہے۔ مصالحے بھی بڑی قیمت پاتے ہیں۔ لیکن نمک سب سے گراں ہے۔ سونا اس کثرت سے ہوتا ہے کہ جب لوگ بازار میں فروخت نہیں کر پاتے تو واپس لے جانا پڑتا ہے۔

شہر جینی کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"یہاں جو، چاول، مویشی اور روئی کی کثرت ہے۔"

علماء کی سرپرستی کرنے کی وجہ سے اس دور میں اہلِ سوڈان میں مصنف بھی پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اور ذاتی کتب خانے رکھنے کا رواج بھی ہو گیا تھا۔ اس زمانہ کے عالموں میں احمد بابا متوفی ۱۰۳۶ھ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ مراکشی حملے کے دوران جن لوگوں کو گرفتار کر کے مراکش بھیجا گیا تھا ان میں ایک احمد بابا بھی تھے جو ۱۵۹۳ء میں گرفتار ہوئے اور ۱۶۰۷ء میں مراکش کے علماء کی سفارش پر رہا کر دیئے گئے اور اپنے وطن ٹمبکٹو واپس چلے گئے۔ ان کو ٹمبکٹو میں اپنے کتب خانہ کے ضائع ہونے کا بڑا افسوس تھا۔ ان کے پاس اپنے بھائیوں سے کم کتابیں تھیں۔ پھر بھی ان کی تعداد سولہ سو سے زیادہ تھی۔ احمد بابا کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں ایک کتاب "معراج الصعود" میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

اہلِ سوڈان بلا کسی جبر کے یا تلوار کے خوف کے اپنی خوشی سے اسلام لائے ہیں۔[1]

احمد بابا ایک اور کتاب کے مصنف بھی ہیں جو سوڈان کے مشاہیر کے حالات پر تھی۔ غالباً اب یہ کتاب موجود نہیں ہے۔

اسکیائے اعظم کے زمانہ میں ایک اور عالم محمد المغلی (ELMAGHLI) کا نام بھی ملتا ہے وہ اگرچہ تلمسان کے رہنے والے تھے لیکن انہوں نے صحرائے اعظم کے بربروں کی بڑی اصلاح کی۔ اسکیائے اعظم کے زمانہ میں وہ شمالی نائیجیریا میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ وہ حکمرانوں کے فرائض کے موضوع پر ایک کتاب کے مصنف ہیں۔

اس دور کے ایک اور ممتاز سوڈانی مصنف عبدالرحمٰن سعدی ہیں۔ وہ ۱۵۹۶ء میں ٹمبکٹو میں پیدا ہوئے تھے اور زنگی نسل سے تھے۔ ان کی بیشتر عمر جینی میں گذری جہاں وہ امام کے فرائض انجام دیتے تھے۔ انہوں نے ملک کے سیاسی معاملات میں بھی حصہ لیا۔ عبدالرحمٰن سعدی تاریخ سوڈان کے مصنف ہیں، جس میں ۱۶۵۶ء تک کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ غالباً سونگھائی سلطنت کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ یہی کتاب ہے۔ سعدی نے اپنے ماخذ کے سلسلے میں دو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک احمد بابا کی لکھی ہوئی "سوانح عمریاں" اور دوسری "کتاب الکبیر"۔

آخری دور

مراکش کا حملہ اہلِ سوڈان کے لئے بڑا تباہ کن ثابت ہوا۔ حملہ کا مقصد چونکہ صرف سوڈان کی دولت پر قبضہ کرنا تھا اس لئے اس کا نتیجہ سوائے لوٹ مار کے اور کچھ برآمد نہ ہوا منصور ذہبی کے جانشین صحرائے اعظم کے پار اس دور دراز خطہ سے کوئی تعلق قائم نہ رکھ سکے۔ ۱۶۱۲ء میں مراکشی

---

[1] تاریخ مراکش از میکنس ترجمہ مولوی انشاء اللہ خاں

حکمران مولائے زیدان سوڈان سے دست بردار ہوگیا۔ اب مراکشی فوجی اپنا امیر خود مقرر کرنے لگے۔ صرف شریف مراکش کا نام خطبہ میں لے لیا جاتا تھا۔ ۱۶۶۰ء میں یہ بھی ختم ہوگیا اور ہر قابض امیر اپنا نام خطبہ میں پڑھوانے لگا۔ مراکش کے ان خود سر امراء نے سوڈانیوں پر مسلسل مظالم کئے اور ان کے دل ہاتھ میں لینے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ ٹمبکٹو اور جینی میں ان کی اولاد اب تک پائی جاتی ہے۔ وسط نائجر کے ظروف، لباس اور خوراک پر ان کا اثر اب تک باقی ہے۔ خصوصاً جینی کا طرز تعمیر اپنی مراکشی جھلک کی وجہ سے پورے سوڈان میں انفرادیت رکھتا ہے۔

سترھویں صدی کے آخر میں ان مراکشیوں کی، جو وہاں رومی کہلاتے تھے، حالت ابتر ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سترھویں صدی مغربی سوڈان کی اسلامی تاریخ کا بدترین زمانہ ہے۔ دریائے نائجر کی بالائی وادی میں غیر مسلم سوڈانی قبائل کا زور بڑھ گیا۔ سینگال یا ارض تکرور پر ۱۶۵۹ء ہی میں غیر مسلم فولا باشندے قابض ہوچکے تھے۔ ان کا یہ غلبہ ۱۷۷۶ء تک قائم رہا۔

اٹھارویں صدی میں مسلمانوں میں پھر ایک نئی زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اس نئی تحریک احیاء کے علمبردار تکرور اور فولا قبائل تھے۔ فولا باشندوں کی اکثریت اگرچہ بارھویں صدی اور پندرھویں صدی کے درمیان مسلمان ہوچکی تھی لیکن انھوں نے ابھی تک تاریخ میں کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں کیا تھا۔ ۱۷۲۰ء میں پہلی مرتبہ فولا مسلمانوں نے گنی میں فوتا جلون[۱] کے علاقہ میں ایک شرعی حکومت قائم کی۔ یہ ایک طرح کی انتخابی حکومت بھی۔ غیر مسلم اقتدار سے یہ آزادی دو بھائیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ان میں ایک کا نام ابراہیم سام بیگو تھا اور دوسرے کا "سوری" اس کے بعد فوتا جلون کے باقی فولا باشندوں نے بھی اسلام قبول کرلیا۔

فوتا جلون میں مسلمانوں کی اس کامیابی کے بعد ۱۷۷۶ء میں سینگال کے علاقہ فوتا تورو (Futa Toro) میں تکرور باشندوں نے بھی غیر مسلم فولا اقتدار کا خاتمہ کردیا[۲]۔ یہاں بھی فوتا جلون کی طرح فولا باشندوں کی اکثریت نے، اقتدار ختم ہونے کے بعد، اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد سینگال کی وادی ڈیریں کے اولف یا ولف (WOLF) قبائل نے بھی اسلام قبول کرلیا۔

فولا قبائل کی سب سے بڑی تحریک انیسویں صدی کے آغاز میں عظیم مصلح، عثمان دان فودیو (USMAN DAN FODIO) کی قیادت میں شروع ہوئی۔ اس تحریک نے مغربی سوڈان پر بھی اثر ڈالا۔ یہاں ٹمبکٹو اور جینی کے درمیان، مسینا (MASINA) کے علاقہ میں ایک فولا تی شیخ

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مقالہ (FUTA DJALLON) [۲] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مقالہ (SENEGAL)

احمدو[1] لوبو نے، جو عثمان دان فودیو کے معتقد تھے اصلاح و تجدید کا کام شروع کیا۔ مسینا کے حکمران کو ان کا بڑھتا ہوا اثر ناگوار گذرا اور اس نے ان کے پیروؤں پر مظالم شروع کر دیئے۔ جینی کے مراکشی بھی ان کے خلاف ہو گئے۔ اور جب یہ تحریک نہ دبی تو سیگو (Segu) کا غیر مسلم بمبارا حکمراں بھی مخالفت میں شریک ہو گیا۔ اب شیخ احمدو نے باضابطہ جہاد کا اعلان کر دیا۔ ان کی مقبولیت اس وقت تک اتنی بڑھ چکی تھی کہ قبائل کی ایک کثیر تعداد جلد ہی ان کے علم کے نیچے جمع ہو گئی اور، باوجود اس کے کہ دشمن کی تعداد کئی گنا زیادہ تھی، انہوں نے اس کو شکست دے کر مسینا پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح احمدو لوبو نے اس شہر کو غیر مسلم بمبارا قبائل سے، جو سترھویں صدی سے قابض چلے آ رہے تھے، آزاد کرا لیا۔ انہوں نے مسینا پر قابض ہونے کے بعد آردو (ARDO) کا لقب اختیار نہیں کیا جو مسینا کے حکمراں استعمال کرتے تھے، بلکہ اپنے لئے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ ۱۸۱۸ء میں احمدو نے اپنے لئے دریائے نائجر کے قریب نیا دارالحکومت بنایا، جس کا نام حمد اللّٰہی تھا۔ جب احمدو کا انتقال ہوا تو وہ وسط نائجر کے علاقہ میں، جینی سے گاؤنگ اور ٹمبکٹو سے دریائے سیاہ والٹا تک، ایک وسیع سلطنت قائم کر چکے تھے، جو ۱۸۶۱ء تک قائم رہی۔

جس زمانہ میں وسط نائجر کی فولا سلطنت عروج پر تھی، اسی زمانہ میں ایک اور سودانی مصلح حاجی عمر تجانی[1] دریائے سنیگال اور نائجر کی بالائی وادی میں اصلاح و تجدید کے کام میں مصروف تھے۔ حاجی عمر تجانی (۱۷۹۴ء تا ۱۸۶۴ء) سنیگال کے علاقہ فوتا تورو کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق قبیلہ تکرور سے تھا۔ ۱۸۲۸ء میں انہوں نے حج کیا اور مکہ اور مدینہ میں چند سال رہ کر دینی تعلیم حاصل کی۔ جب وہ حجاز سے واپس آئے تو سنیگال کے ساحلی علاقہ پر فرانسیسی قابض ہو چکے تھے۔ اور اب وہ اندرونِ ملک بڑھنا چاہتے تھے۔ حاجی عمر نے فرانسیسیوں کے خلاف افریقی باشندوں کو منظم کیا اور تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ ہزاروں غیر مسلموں کو مسلمان کیا۔ ۱۸۴۸ء میں وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ اپنے مخالفوں کا قوت کے ذریعہ مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ ۱۸۵۲ء میں انہوں نے بالائی نائجر کے علاقہ میں، ماندنگ پر اور ۱۸۵۴ء میں کارتا پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۵۷ء میں انہوں نے سنیگال کی بستی مدینہ پر، جو فرانسیسیوں کے قبضہ میں تھی، حملہ کیا۔ لیکن اس حملہ میں ان کو ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی سے غالباً ان کو اپنی کمزوری کا احساس ہوا اور انہوں نے ضروری سمجھا کہ فرانسیسیوں سے ٹکر لینے سے پہلے اپنی قوت اور مضبوط کر لی جائے۔ چنانچہ انہوں نے پھر مشرق کا رخ کیا۔ یہاں ان کا ٹکراؤ وسط نائجر کی فولا سلطنت سے ہوا، جس کا

---

[1] حاجی عمر تجانی کے حالات کے لئے دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے حسب ذیل مقالے (Hadj Senegal اور Madingo - Umer)

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ حاجی عمر کو اس مہم میں کامیابی ہوئی اور ۱۸۶۱ء میں وہ سیگو پر اور ۱۸۶۲ء میں مسینا پر قابض ہو گئے۔ دو سال بعد، جبکہ وہ فولانیوں کی ایک بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھے، وہ شہید ہو گئے۔

حاجی عمر تجانی کے انتقال پر اسلام سوڈان کا سرکاری مذہب بن چکا تھا۔ ان کے جانشینوں نے سلطنت کے استحکام کے لئے پوری کوشش کی لیکن فرانسیسیوں کی بڑھتی ہوئی قوت نے ان کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ۱۸۸۱ء میں فرانسیسیوں نے فوتا جلوں کی مسلم مملکت کی آزادی کا، جو ۱۷۲۰ء سے قائم تھی، خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اندرون ملک میں پیش قدمی شروع کر دی۔ حاجی عمر تجانی کے لڑکے احمدو نے ان کا کئی سال تک مقابلہ کیا لیکن فرانسیسیوں کے برتر اسلحہ کے مقابلہ میں کامیابی نہ ہو سکی۔ ۱۸۹۰ء میں فرانسیسیوں نے سیگو پر اور ۱۸۹۳ء میں جینی اور ٹمبکٹو پر قبضہ کر کے وسط نائجر کی اس اسلامی مملکت کا خاتمہ کر دیا۔

حاجی عمر تجانی کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں ایک اور مصلح امام صمد (۱۸۴۷ء تا ۱۹۰۰ء) نے اصلاح و تجدید کے سلسلے میں بڑا نام پیدا کیا۔ امام صمد مندنگو قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور وہ گنی کے رہنے والے تھے۔ وہ سموری توری کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ انہوں نے بالائی نائجر اور سمندر کے درمیانی علاقے میں ہزاروں بے دین افریقی باشندوں کو مسلمان کیا اور جب فرانسیسی فوتا جلوں پر ۱۸۸۱ء میں قابض ہو گئے تو انہوں نے گنی اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ میں فرانسیسیوں کی پیش قدمی روکنے کی بڑی کوشش کی۔ ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۶ء میں اور اس کے بعد بھی فرانسیسیوں سے ان کے کئی معرکے ہوئے لیکن ان لڑائیوں میں امام صمد کو ناکامی ہوئی اور فرانسیسیوں نے ۱۸۹۳ء کے قریب ان کے دارالحکومت بساندوگو (BISANDUGU) پر جو لائبریا کی سرحد پر واقع ہے، قبضہ کر لیا۔ لیکن اس حوصلہ مند انسان نے ہمت نہ ہاری اور جلد ہی بالائی نائجر اور سیاہ والٹا کے درمیان بے دین قبائل کو مفتوح کر کے، ایک نئی مملکت قائم کر لی۔ ۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۵ء میں فرانسیسیوں نے یہاں بھی ان پر حملہ کیا لیکن اس مرتبہ ان کو ناکامی ہوئی۔ فرانسیسیوں نے بالآخر تین سال بعد ۱۸۹۸ء میں لائبیریا کے شمال میں کوالا (CAVALLA) کے مقام پر امام صمد کو شکست دی اور ان کو گرفتار کر کے وسطی افریقہ کے علاقہ گابون میں جلاوطن کر دیا۔

اس طرح ۱۸۹۸ء میں مغربی افریقہ میں فرانسیسی استعمار کے خلاف آخری مسلح مدافعت کا خاتمہ ہو گیا۔

لہ ماہنامہ "کرنٹ ہسٹری" فروری ۱۹۵۸ء۔

فرانس مغربی افریقہ پر ساٹھ سال قابض رہا۔ اس کے بعد حکومت فرانس نے آزادی کی بڑھتی ہوئی تحریک کے پیش نظر اس خطہ سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ستمبر ۱۹۵۸ء میں گنی کو آزادی مل گئی۔ اس کے پہلے صدر شیخ توری (SEKU TOURE) ہیں جو امام صمد یعنی سموری کی اولاد میں ہیں۔ جون ۱۹۶۰ء میں سنیگال اور فرانسیسی سوڈان آزاد ہو گیا۔ سوڈان نے اپنا نام بدل کر قدیم سلطنت کے نام پر مالی کر دیا۔ مالی کے صدر مودیبو کیتا (MODIBO KEITA) ہیں۔ وہ سوڈان کے رہنے والے ہیں۔ اور بمبارا قبیلے کے کیتا خاندان سے ہیں۔ یہ وہی خاندان ہے جس سے مالی کے مشہور حکمراں ماری جاطہ اور منسا موسیٰ کا تعلق تھا۔ مودیبو کیتا مسلمان ہیں۔ سنیگال کے صدر مسٹر سنگھر عیسائی ہیں لیکن وہاں کے وزیر اعظم محمد ضیاء (MAMADU DIA) مسلمان ہیں۔

اگست ۱۹۶۰ء میں فرانسیسی مغربی افریقہ اور استوائی افریقہ کے سب علاقے آزاد ہو گئے۔ صرف موریطانیا کو نومبر میں آزادی ملی۔ موریطانیا کی اکثریت بربر باشندوں پر مشتمل ہے۔ مغربی افریقہ کی یہ واحد مملکت ہے جس نے خود کو ایک اسلامی جمہوریہ قرار دیا ہے۔ یہاں کے وزیر اعظم کا نام محمد مختار ہے۔

مغربی افریقہ کی نو آزاد مملکتوں میں سے حسب ذیل میں مسلمانوں کی اکثریت ہے:

موریطانیا	۹۹ فی صدی	گنی	۴۰ فی صدی
ناجر	۸۵ فی صدی	مالی	۶۳ فی صدی
سنیگال	۷۹ فی صدی	چاڈ	۶۲ فی صدی

معراج انسانیت

حضور خاتم النبیین کی حیات طیبہ قرآن کریم کے آئینے میں۔ سیرت مقدسہ پر حسین ترین تصنیف۔ سابقہ کتب سماوی کی حیرت انگیز کہانی۔ ختم نبوت کا عظیم فلسفہ۔

بڑا سائز۔ قریب نو سو صفحات۔ اعلیٰ درجہ کا کاغذ ——— قیمت فی جلد ۸ بیس روپے

ملنے کا پتہ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

دِین و دانش رَا غلام اَرزاں دہد

ہندوستان کے نیشنلسٹ علماء، تحریک پاکستان کی سخت مخالفت کرتے تھے، جب ان سے کہا جاتا کہ ہندو جیسی تنگ نظر اور کم ظرف قوم کی محکومی کی زندگی، اس قدر ذلت و رسوائی کی زندگی ہوگی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، تو وہ کہتے کہ ہم یہاں سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کریں گے اور ہمیں کوئی ذلیل و خوار نہیں کر سکے گا۔

ہندوستان کا مسلمان، ہندوؤں کے ہاتھوں کس قدر بے پناہ مظالم کا شکار ہو رہا ہے، وہاں کے آئے دن کے واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ لیکن وہاں کا طبقۂ علماء، ہندو کی خوشامد میں کس پستی تک پہنچ چکا ہے، اس کا اندازہ ذیل کے مضمون سے لگ سکے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ بھارت ماتا کے متعلق یہ کچھ کبھی کسی ہندو نے بھی نہیں کہا ہوگا۔

یہ مضمون، دیوبند کے ماہنامہ تذکرہ کی جولائی ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ نیشنلسٹ علماء کے سرخیل، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کی یادگار میں شائع ہوتا ہے۔

مضمون، مع عنوانات حسب ذیل ہے (طلوع اسلام)

اوّلیت ہندوستان

کتب تفاسیر قرآن اور حدیث کی صحیح روشنی میں

از:- جناب مولانا عبدالسلام صاحب قاسمی کیرانوی

ذیل کا مضمون..... ہندوستان کی مقدس قدیم تاریخ کو دُہرا بھی رہا ہے اور مستقبل کے استوار کرنے میں تعاون بھی کرتا ہے ـــــ اور داعیہ حب الوطن کو مضبوط اور مستحکم بنا کر ایمان کی زیادتی کا باعث

بھی بنے گا - اور یہ بھی بتائے گا کہ ہندوستان کی عظمت کیا ہے؟

بلاشبہ مدینہ منورہ، مکہ معظمہ اور بیت المقدس وہ بابرکت مقامات ہیں جن کا احترام ہر ایک مسلمان پر فرض اور ان کی محبت کے بغیر ایمان ناقص - اسلامی عقائد کے بموجب ان کے برابر تقدس، عظمت اور جلالت دنیا کے کسی رقبہ یا خطۂ ارضی کو قطعاً حاصل نہیں ہو سکی، لیکن اسلامی تعلیمات ہی نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ہمارا وطن ہندوستان بھی بہت سی عظمتوں اور برکتوں کا منبع اور سرچشمہ ہے، اس لئے چند فضائل ہدیۂ ناظرین کئے جا رہے ہیں -

(۱) خلیفۃ اللہ آدمؑ کی سب سے پہلی منزل ہندوستان ہے -

(۲) انسانیت کا سب سے پہلا دارالخلافت ہند ہے -

(۳) آفتاب نبوت کی شعاعوں نے سب سے پہلے سرزمین ہند کو منور کیا -

(۴) جنت کے پتے آدم کے ساتھ ہندوستان میں اترے جس کی وجہ سے ہندوستان خوشبو میں تمام دنیا سے بڑھا ہوا ہے -

(۵) جنتی پھل سب سے پہلے آدمؑ کے ساتھ ہند کی سرزمین پر لائے گئے -

آدم علیہ السلام کا ہندوستان میں جنت سے اُترنا ثابت ہے چنانچہ تفسیر ابن کثیر جلد اول میں ہے -

> اور حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "جب اللہ نے فرمایا یہاں سے نکلو تو آدمؑ ہند میں اُترے ان کے ساتھ حجر اسود اور کچھ جنت کے پتے تھے وہ پتے ہند میں پھینک دیئے اس سے یہ سارے خوشبو کے درخت پیدا ہوئے، عطر ہندوستانی کی اصل وہی جنت کے پتے ہیں - آدمؑ ان پتوں کو بطور یادگار نہایت افسوس کے ساتھ اپنے ہمراہ مٹھی بھر جنت سے لیتے آئے تھے -

(ترجمان القرآن بلطائف البیان جلد ا صفحہ ۸۰)

نیز سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا ہے "اللہ نے جب آدمؑ کو زمین پر اتارا ہر چیز کی صنعت سکھا دی، کچھ پھل جنت کے بطور توشہ اور زادراہ ساتھ کر دیئے یہ تمہارے پھل وہیں سے آئے ہیں صرف اتنی سی بات ہے کہ یہ بگڑ جاتے ہیں وہ خراب نہیں ہوتے تھے" (ترجمان القرآن بلطائف البیان ج ا - صفحہ ۸۰)

نیز بزار ابن ابی حاتم اور طبرانی رحمہم اللہ نے اسی کے موافق روایت کی ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ارشاد فرماتے ہیں "سب سے زیادہ خوشبو دار یہی زمین ہند کی ہے، آدمؑ یہیں اُترے تھے، جنت کی خوشبو یہاں کے درختوں میں لگ گئی ہے - (ترجمان القرآن جلد ا)

اور علامہ ابن جریر، بیہقی اور ابن عساکر علیہم الرحمہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اسی مضمون کی روایت ذکر کی ہے -

روایت بالا سے آدمؑ کا ہندوستان میں اُترنا ثابت ہے تو وہ یقینی طور پر انسانیت کا مرکز اور دارالخلافت بھی ہوگا۔ کیونکہ آدمؑ معلّمِ انسانیت بھی تھے اور خداوندی خلیفہ بھی، جن کی ضیا پاشیوں سے اوّل ہندوستان کی سرزمین جگمگائی پھر دنیا میں غلغلہ ہوا۔

حجرِ اسود جنت سے ہندوستان ہی میں سب سے پہلے لایا گیا۔

حضرت سدیؒ نے یوں روایت کی ہے "کہ آدمؑ جب دنیا میں اُترے تو ایک ہاتھ میں جنت کا وہ یاقوت تھا جس کا نام حجرِ اسود ہے۔ (صحیح السند روایت سے ثابت ہے کہ یہ اس قدر روشن تھا کہ آفتاب کا نور اس کے سامنے ماند تھا رفتہ رفتہ ابن آدم کی خطاؤں نے سیاہ کر دیا۔)

اور دوسرے ہاتھ میں جنت کے کچھ تھوڑے سے پتے تھے، چنانچہ ہندوستانی درختوں کی خوشبو انہیں پتوں کے اثرات باقیات میں سے ہے (دلائل نبوت بیہقی بحوالہ ہمارا ہندوستان)

یہ ایک حقیقت ہے کہ لونگ، الائچی، کیوڑا، گلاب، دارچینی، کافور، چنبیلی، اور بیلا وغیرہ اسی طرح مشک و عنبر اور زعفران ہندوستان ہی میں بکثرت پیدا ہوتی ہے، اور یہ سب اسی خطۂ ہند کو آدمؑ کے طفیل نصیب ہوا۔

جنت سے عصائے موسوی بھی سب سے پہلے اسی خطہ میں آدمؑ کے ساتھ اتارا گیا۔

چنانچہ کتب تفاسیر میں بصراحت مذکور ہے، اور ترجمان القرآن بلطائف البیان رج ۱ میں ہے "یہ عصا درخت آس کا تھا" ہمراہ آدمؑ کے جنت سے آیا تھا، دس گز کا لمبا تھا، برابر طول موسیٰ علیہ السلام کے، اس کا نام "عليق" یا "نبعہ" تھا اور علامہ محی السنہ، علاء الدین علی بغدادیؒ اپنی تفسیر میں وضاحت فرماتے ہیں کہ وہ عصا آس جنت کا تھا، دس گز لانبا موسیٰ علیہ السلام کے قد کے برابر اور اس میں دو شاخے تھے جو تاریکی میں روشنی دیتے تھے۔

مزید اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یعنی آدمؑ اپنے ساتھ جنت سے لائے پھر یکے بعد دیگرے حضرت شعیبؑ تک پہنچا، اور آپ نے موسیٰؑ کو عطا فرمایا۔ (تفسیر خازن۔ جلد اول)

اس مذکورہ بالا وضاحت سے ہندوستان کی عظمت دوبالا ہو جاتی ہے۔

تابوت بنی اسرائیل بھی جنت سے سب سے پہلے ہند میں اتارا گیا۔

علامہ علی بغدادی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے تابوت آدمؑ پر اتارا تھا، جس میں انبیاء علیہم السلام کی صورتیں تھیں، وہ شیشم کی لکڑی کا بنا ہوا تھا، لمبائی تین ذراع اور چوڑائی دو ذراع تھی، وہ آدمؑ کے بعد شیثؑ کے پاس رہا، پھر وہ ان کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا ــــ یہاں تک کہ وہ طالوت بادشاہ کے پاس پہنچا۔

(تفسیر خازن جلد اول)

نیز ابن سعد، طبری، ابن جریر، اور ابن منذر وغیرہ علمائے تاریخ و سیر نے عصاء موسوی اور تابوت بنی اسرائیل کو بھی جنت کی انہیں یادگاروں میں گنایا ہے جو حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے ساتھ ہندوستان میں نازل کی گئیں۔ (سبحۃ المرجان فی تاریخ ہندوستان)

نور محمدی کا سب سے پہلا مطلع ہندوستان ہے۔

آدم علیہ السلام جب ہندوستان آئے نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پیشانی میں چمکتا تھا پھر وہ نور پشت در پشت منتقل ہو کر مکہ معظمہ سے ظاہر ہوا، چونکہ حضرت آدمؑ اور آپ کے بعد حضرت شیث علیہ السلام ہندوستان میں سکونت پذیر تھے۔ اس لئے لا محالہ نور محمدیؐ اور اس افضل سرمدی کا سب سے پہلا مطلع ارض ہند ہے اور سب سے آخری مشرق حجاز پاک ہے، چنانچہ اس موقع پر عہد رسالت کے مشہور شاعر اور جلیل القدر صحابی حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کا یہ شعر کس قدر معنی خیز ہے ؎

ان الرسول لنور یستضاء بہ

مہند من سیوف اللہ مسلول

یعنی بلاشبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک نور ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی ایک شمشیر براں جو ہندوستانی ساخت کی ہے۔ (ہمارا ہندوستان)

وحی الٰہی کا سب سے پہلا ہبط ہند ہے۔

حضرت جبریل علیہ السلام کا نزول سب سے پہلے اس سرزمین ہند میں ہوا۔

سرکار کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی رسالت کا اعلان بھی اسی خطہ میں ہوا۔

دنیا میں سب سے پہلے خدا کی وحدانیت کا اعلان اور اظہار اسی سرزمین پر ہوا۔

اس کی تفصیل یہ ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، کہ جب آدم علیہ السلام کی تسکین کے لئے حضرت جبریلؑ کو بھیجا گیا تو حضرت جبریلؑ نے آکر ندا دی۔

اللہ اکبر اللہ اکبر اشہد ان لا الٰہ الا اللہ اشہد ان محمد رسول اللہ۔

یعنی جس طرح اذان میں کہا جاتا ہے، حضرت آدمؑ نے جب اسم گرامی "محمد" سنا تو عرض کیا، خداوندا یہ کون ہے۔ جواب ملا کہ آپ کی اولاد کے سب سے آخری نبی۔

(طبرانی، ابونعیم۔ ابن عساکر وغیرہ)

اس روایت سے نزول جبریل علیہ السلام کا ثبوت اور وحدانیت کا اعلان بھی ہے، اور ختم الرسل کی رسالت کا اظہار ثابت ہو رہا ہے، مزید یہ بھی ہے کہ نبی کی دل جوئی اور غمخواری کے لئے ایک عظیم المرتبت فرشتہ کو بھیجا گیا۔ غالباً یہ واقعہ حضرت حوا کی ملاقات سے پہلے کا ہے۔

دنیا میں سب سے پہلے خدا کی ربوبیت کا اقرار ہند کی سرزمین پر ہوا۔

دنیا کا سب سے پہلا عہد "الست بربکم" ہندوستان میں لیا گیا۔

دنیا میں ہند ہی ایسی سرزمین ہے جہاں سارے انسانوں کا بیک وقت اجتماع "عہد الست" کے موقع پر ہوا۔

اس اجمال کی تفصیل کے بارے میں مفسر اعظم عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے:

"اسی مضمون کو صاحب ترجمان القرآن بلطائف البیان نے بھی ذکر کیا ہے تحریر کرتے ہیں:

ابن عباسؓ نے کہا سب سے پہلے جو اللہ نے آدمؑ کو طرف زمین کے اتارا تو "دہناء" زمین ہند پر اتارا، پھر ان کی پشت کو مسح کیا، ہر جان جس کا اللہ تعالیٰ تا یوم قیامت خالق و باری تھا وہ نکالی، پھر ان سب سے عہد و پیمان لیا۔ پھر ہر ایک جان کو خود اس پر گواہ ٹھہرا دیا یہ کہا "الست بربکم" انہوں نے جواب دیا "بلیٰ شھدنا"۔ (ترجمان القرآن)

اور دوسری جگہ ہے۔

موضع میثاق میں آپس میں مختلف رائیں ہوئیں، تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، موضع میثاق ارض دہناء ہی تو ہے۔ جہاں آدمؑ کو پہلی مرتبہ اتارا گیا۔

تصریحات بالا بتلا رہی ہیں کہ "عہد الست" ہندوستان ہی میں لیا گیا۔

تمام انبیاء کرامؑ نے سرور کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کی تصدیق کا عہد و پیمان ہندوستان کی سرزمین پر کیا۔

تمام انبیاء کرام اور سردار رسل کے اطوار مبارکہ سے سب سے پہلے ہند کی زمین بہرہ اندوز ہوئی۔

قال البغوی قال اللہ عزوجل للانبیاء حین استخرج الذریۃ

من صلب آدم والانبیاء فیھم کالمصابیح اخذ علیھم المیثاق فی امر محمد صلی اللہ علیہ وسلم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ اقررتم واخذتم علی ذالکم اصری۔ الایہ۔ تفسیر غرائب جلد آل

قرآن حکیم کی اطلاع کے بموجب عہد الست کے موقعہ پر ایک دوسرا عہد بھی جملہ انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا تھا جس میں ہر نبی نے آنے والے نبی کی تصدیق و اعانت کا میثاق کیا تھا' اور چونکہ سب کے بعد میں سلسلہ نبوت کا دور حضرت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہونے والا تھا اس لئے ثابت ہوا کہ بلا استثناء جملہ انبیاء علیہم السلام نے سرور کائنات کی تصدیق کا نیز آپ پر ایمان لانے اور امداد کرنے کا عہد اس سرزمین میں کیا تھا۔

بہرحال ارض ہندی وہ ارض مقدس ہے جہاں سلسلہ رشد و ہدایت خداوندی، معرفت قرب الٰہی، نجات اخروی اور فوز آخرت و فلاح ابدی کے حصول کے لئے عہد و پیمان ہوا۔ (سبحۃ المرجان)

اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عہد الست کا وقوع سرزمین ہند میں ہوا۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ ذریت آدمؑ سے عہد لینے کے بعد انبیاء کرامؑ سے بھی عہد لیا گیا تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اسی سرزمین پر وقوع پذیر ہوا۔ اس موقعہ پر لامحالہ تمام ہی انبیاء کرام علیہم السلام کے انوار مبارکہ سے ہند فیضیاب ہوا۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ ۔ ایک طویل حدیث کے ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کر کے بیان فرماتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد کی روحوں کے زمرہ میں کچھ روحیں دیکھیں جن کے انوار غیر معمولی طور پر سب سے بڑھ کر تھے، حضرت آدمؑ کو خود حیرت ہوئی اور پوچھا کہ خداوندا یہ کون ہیں؟ ارشاد ہوا کہ انبیاء کی ارواح مبارکہ ہیں۔ (سبحۃ المرجان)

ہندوستان ہی میں سب سے پہلے سونے چاندی کے ذخائر حضرت آدم علیہ السلام کی درخواست پر ہندوستان میں ہوئے۔

علامہ ابن عساکر علیہ الرحمہ کی روایت سے ثابت ہے کہ سونا اور چاندی حضرت آدمؑ کی درخواست پر پیدا کیا گیا چنانچہ اسکے فلزات سب سے پہلے ہندوستان میں پیدا ہوئے، اسی طرح یاقوت، ہیرا، زمرد، اور موتی وغیرہ ہندوستان کے پہاڑوں اور سمندروں میں بکثرت ہوتے ہیں۔

الہامی روایات و مکاشفات ان سب کو حضرت آدم کے ورود مسعود کی برکات طیبات ثابت کرتے ہیں۔

ہندوستان پارچہ بافی کی صنعت کا پہلا مرکز ہے۔

آدم کے شجر ممنوعہ کھا لینے سے جنتی لباس خود بخود تن طہر سے جدا ہو گیا تھا' اور اپنا جسم مبارک دونوں نے جنت کے پتوں سے چھپا رکھا تھا اور اسی طرح دنیا میں اپنا بدن چھپائے ہوئے آئے تھے۔

ڈھانکا تھا، لیکن پتوں سے بدن ڈھانکنے کا یہ دور زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہا، بلکہ حضرت آدم ہی نے صنعت پارچہ بافی کی ایجاد بھی کی۔ (ملاحظہ ہو ہمارا ہندوستان)

مندرجہ بالا مضمون کے آخر میں "باقی آئندہ" لکھا ہوا ہے لیکن وہ قسط رسالہ مذکور **طلوع اسلام** کی اگست کی اشاعت میں شائع نہیں ہوئی۔ ہمارا خیال ہے کہ مضمون نگار تلاش کر رہے ہوں گے کہ اس کی "سند" بھی کہیں سے مل جائے کہ جلال خداوندی کی پہلی نمود ہمالیہ پربت پر ہوئی تھی اور حضور نبی اکرمؐ کی پیدائش بھی (معاذ اللہ) گنگا اور جمنا کی ترائی میں ہوئی تھی۔ اور قرآن (پناہ بخدا) رشی کیش کے جنگلوں میں نازل ہوا تھا! سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ

دین و دانش را غلام ارزاں دہد — تا بدن را زندہ دارد جاں دہد
گرچہ بر لب ہائے او نام خداست — قبلۂ او طاقت فرماں رواست
از غلامی مرد حق زنار بند — از غلامی گوہرش نا ارجمند
آبروئے زندگی در باختہ — چوں خراں، با کاہ و جو در ساختہ

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ جب اس جمہوری دور میں، فرماں روا قوم کو خوش کرنے کے لئے، یہ حضرات اس سطح تک اتر سکتے ہیں تو شخصی حکومتوں کے زمانہ میں یہ کیا کچھ نہیں کرتے ہوں گے!

اور تیسری بات یہ کہ ہماری روایات کی زنبیل بھی کس قدر وسیع ہے کہ اس میں سے جو چاہو نکل سکتا ہے!

اقبال اور قرآن

فکر اقبال کا اصل سرچشمہ کیا ہے؟

اقبال نے قرآنی تعلیم کو کس حسین انداز میں پیش کیا؟ اس موضوع پر بے نظیر تصنیف ہے۔

قیمت:- دو روپے

ملنے کا پتہ:- میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷۔بی شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

ایک لفظ کے معنی بدل جانے سے!

یہ بات اکثر لوگوں کے لئے سخت حیرت کا موجب ہوتی ہے، اور وہ بار بار سوال کرتے ہیں، کہ جب، اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، قرآن کریم مسلمانوں کے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود رہا، تو پھر کیا وجہ تھی کہ ہمارے ہاں اس قدر غیر قرآنی تصورات اور خلاف قرآن معتقدات و مسالک آگئے اور رفتہ رفتہ "عین اسلام" بن گئے؟ سوال واقعی اہم ہے، اور مستفسرین کی حیرت بالکل بجا۔ تاریخی طور پر یہ کچھ کیسے ہوا تھا، اس کے متعلق ہم طلوع اسلام میں ایک تفصیلی مقالہ (بعنوان، اسلام آگے کیوں نہ چلا) شائع کر چکے ہیں، جواب "سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد میں شامل ہے۔ اس وقت ہم اس کے ایک اور گوشے کو سامنے لاتے ہیں، اور صرف ایک مثال سے اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم قرآن سے ہٹ کر اپنے موجودہ مقام تک کیسے آگئے؟

اگر ہم قرآن کریم کی پوری تعلیم کا ملخص بیان کرنا چاہیں تو اُن دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے جو اس کی سب سے پہلی سورہ (الفاتحہ) میں آئے ہیں یعنی

إِيَّاكَ نَعْبُدُ

عربی لغت اور قرآن کریم، دونوں، کی تصریحات کے مطابق عَبْدٌ کے معنی ہیں غلام۔ یا محکوم۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ، قوم فرعون کی طرف گئے اور ان کے سامنے اپنی دعوت الی الحق پیش کی تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم ان کی بات کیسے مان لیں جو ہمارے جیسے انسان ہیں۔ وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (۲۳/۴۷) "اور ان کی قوم ہماری محکوم ہے"۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کے استعمال کی رُو سے، عابد کے معنی محکوم کے ہیں۔ اس سے عَبَّدَ (تَعْبِید) کے معنی ہیں کسی کو محکوم بنا لینا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ ہمارے تم پر اس قدر احسانات ہیں اور تم یوں سرکش ہوتے جا رہے ہو، تو آپؑ نے جواب میں فرمایا کہ وہ احسانات اس کے سوا کیا ہیں اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۲۶/۲۲)

کریم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام اور محکوم بنا رکھا ہے۔

اسی سے لفظ "عبادت" ہے جسے قرآن کریم نے ٹھیک انہی معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں آجکل "حکومت" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ سورۂ کہف میں ایک جگہ ہے وَلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۱۱۰)۔ انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے رب کی "عبادت" میں کسی کو شریک نہ کریں۔ اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶) "وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ اسی طرح سورۂ یوسف میں پہلے کہا گیا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) "حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی"۔ اور اس کے بعد ہے۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ (۱۲/۴۰) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت (عبادت) اختیار نہ کرو۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کس طرح "حکومت" اور "عبادت" کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال کرتا ہے؟

اسی مفہوم کی وضاحت سورۂ نحل کی اس آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (۱۶/۳۶)۔ یعنی خدا کی طرف سے جو رسول بھی آتا تھا وہ یہی پیغام لاتا تھا کہ اللہ کی عبودیت اختیار کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔ "طاغوت" ہر غیر خداوندی طاقت، یا حکومت کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ قوت جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتے۔ لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام کی دعوت یہ تھی کہ محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو اور ہر غیر خدائی حکومت سے اجتناب کرو۔ دوسرے مقام پر "طاغوت سے اجتناب کرو" کی وضاحت ایک اور انداز سے کر دی، جہاں کہا کہ ذرا ان لوگوں کی حالت پر غور کرو جو بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا قرآن پر ایمان ہے یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِهٖ (۴/۶۰) اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین کی رو سے کرائیں، حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر خدائی قوتوں سے اجتناب اور انکار کریں۔ "طاغوت سے کفر یا انکار" کی صراحت سورۂ بقرہ کی اس آیت میں کر دی گئی جہاں کہا گیا کہ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ ...... (۲/۲۵۶) جس نے طاغوت سے کفر (انکار) کیا اور اللہ پر ایمان لے آیا۔ اس نے اس ایک محکم سہارے کو تھام لیا۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ "طاغوت کی محکومیت" کو چھوڑ کر خدا کی محکومیت کس طرح اختیار کی جائے۔ یعنی یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم نے خدا کی محکومیت اختیار کر لی ہے۔ سو اس کے متعلق اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)۔ جو قوم قرآن کریم کے

مطابق حکومت (فیصلے) نہیں کرتی، تو یہی لوگ کافر ہیں۔

ان تصریحات[1] سے واضح ہے کہ عربی لغت اور قرآن کریم کی رُو سے، "خدا کی عبادت" کے معنی ہیں خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔ اور اس محکومیت کی عملی شکل ہے اسی نظام میں رہنا جس میں تمام امور کے فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق ہوں۔ ایسا کرنے والے کو عابد کہا جائے گا۔ اس اعتبار سے

اِیَّاکَ نَعْبُدُ

کے معنی ہوں گے ـــــ ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ تیرے سوا کسی اور کی حکومت کے تابع نہیں رہنا چاہتے۔ ہم اپنے تمام معاملات کے فیصلے تیری کتاب کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ ہم غیر خداوندی قوانین و احکام کی اطاعت کبھی نہیں کریں گے۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا عملی مفہوم وہ حکومت تھی جس کا وعدہ خدا نے کیا تھا اور جو نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے متشکل ہوئی تھی۔ یہ وعدہ سورۂ نور میں ان الفاظ میں دیا گیا تھا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور عمل صالح کریں: خدا نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے وہ انہیں اس دنیا میں حکومت عطا کرے گا، جس طرح اس نے ان سے پہلے اس قسم کے لوگوں کو حکومت عطا کی تھی ـــــ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ۔ جو دین اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے، اُسے متمکن کرے گا ـــــ یعنی دین کا تمکن اسی حکومت کے ذریعے ہونا تھا۔ اس تمکن کا نتیجہ کیا نکلنا تھا؟ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا (۲۴/۵۵)۔ وہ صرف میری عبادت (محکومیت) اختیار کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کریں گے۔" یعنی "خدا کی عبادت" (محکومیت) صرف اس حکومت میں رہتے ہوئے ہو سکتی ہے جو دین کے تمکن کے لئے عمل میں آئے، جس میں تمام معاملات کے فیصلے کتاب خداوندی کے مطابق ہوں اور اس میں کسی انسانی فیصلے کو شریک نہ کیا جائے۔

یہی وہ حکومت جسے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ اس میں حضورؐ کو حکم تھا کہ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)۔ تم، لوگوں کے فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق کرو۔ اُس وقت، اس طرح "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کا عملی مظاہرہ ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ یہ جو نماز میں رکوع و سجود ہے، تو یہ اسی محکومیت و اطاعت کا محسوس حرکات میں اظہار ہے۔ جیسے کسی کی تعظیم کا اظہار، ہاتھ اٹھانے سے، اور کسی کی بات تسلیم کر لینے کا اظہار سر جھکانے سے کیا جاتا ہے۔ عہد "محمدؐ رسول اللہ والذین معہ" میں عبادت سے یہی مفہوم تھا۔ یعنی خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔

[1] ہم نے یہ تصریحات "لغات القرآن" جلد سوم۔ عنوان (ع۔ ب۔ د) سے لی ہیں جو حضرات زیادہ تفصیل چاہتے ہوں وہ اس عنوان کا خود مطالعہ کریں۔

جب اُس مبارک و مسعود عہد کے بعد، خدا کی حکومت کی جگہ انسانوں کی حکومت قائم ہوئی تو "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کے اقترار کے بعد، مسلمان اس قسم کی حکومت کی اطاعت کر نہیں سکتا تھا۔ یہ خدا کی حکومت کے علی الرغم طاغوت کی حکومت تھی۔ یعنی غیر خداوندی قوانین کی فرماں روائی۔ مسلمان کے لئے 'اپنے اُس اقترار' (یا ایمان) اور اسکی عملی زندگی میں، مطابقت کی کوئی شکل ہی نہیں تھی۔ لیکن دیکھیئے کہ اس مشکل ترین مسئلہ کا آسان ترین حل کیا سوچ لیا گیا۔ وہ حل یہ تھا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے معنی کر لئے گئے "ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں"۔ بس، اس سے مسئلہ حل ہو گیا۔ محکومیت غیر اللہ کی اور پرستش خدا کی۔ غیر اللہ کو اس سے واسطہ ہی نہیں ہوتا کہ آپ پرستش کس کی کرتے ہیں۔ اس نے تو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ آپ محکومیت کس کی اختیار کرتے ہیں۔ اگر آپ محکومیت' اس کی اختیار کرتے ہیں، تو پرستش جس کی جی چاہے کرتے رہیں۔ بالفاظ دیگر اب مسلمان کی حالت یہ ہو گئی کہ محکومیت' غیر اللہ کی۔ اور محکومیت کے اظہار کی محسوس حرکات، خدا کے لئے۔ (قرآن کریم نے جہاں کفار اور مشرکین کی "عبادت" کا ذکر کیا ہے تو اس سے مراد، اظہار محکومیت (اطاعت کی یہی محسوس حرکات ہیں)۔ قرآن نے، محکومیت (اطاعت کو خدا کے لئے مختص کر دیا تھا اس لئے اس اطاعت کے اظہار کی محسوس حرکات' (رکوع وسجود) بھی خدا ہی کے لئے مختص تھیں۔ لیکن اب مسلمان کی زندگی کے دو حصے ہو گئے۔ یعنی محکومیت کے لئے اور "معبود" تجویز کر لیا گیا اور اظہار محکومیت کے لئے اور "معبود"۔ حکومت انسانوں کی قائم رہی، پرستش خدا کی ہوتی رہی۔۔۔ آپ نے دیکھا کہ ایک لفظ کے معنی بدل دینے سے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی؛ اُس وقت سے آجتک یہی ثنویت قائم ہے۔۔۔ حکومت، انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی، خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو' اور پرستش خدا کی۔۔۔۔ یہی انداز مسلمان حکمرانوں کے تابع رہا، اور یہی (مثلاً)، ہندوستان میں، غیر مسلم حکمرانوں (انگریزوں) کے زیر حکومت۔

"عبادت" کا یہی وہ مفہوم (پرستش[1]) تھا جس کے سہارے تحریک پاکستان کی مخالفت کرنے والے' علمائے کرام آگے بڑھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ سیکولر گورنمنٹ (یا بالفاظ صحیح ہندوؤں کی حکومت) میں، مسلمانوں کو' خدا کی پرستش کی اجازت ہو گی' اس لئے اس حکومت کے خلاف اعتراض کیا ہو سکتا ہے؟

---

[1] ہندوستان میں 'پرستش کی جگہ "بندگی" کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ "بندگی" کا لفظ' اپنی اصل کے اعتبار سے' غلامی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا (یعنی کسی کا بندہ ہونا)۔ لیکن اس کا عام استعمال "پرستش" کے معنوں ہی میں ہوتا ہے۔ اس لئے پرستش یا بندگی' ایک ہی بات ہے۔

انگریز کی حکومت کے خلاف اعتراض اس لئے ہے کہ وہ "غیر ہندوستانی" ہے۔ ہندوستان کی حکومت، ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ اس حکومت میں، مسلمان کو، خدا کی پرستش کی اجازت ہوگی۔ لہٰذا اسلام کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ ان کی یہی وہ ذہنیت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہماری تاریخ میں، جب پہلی بار، خدا کی حکومت کی جگہ غیر خدائی حکومت مسلط ہوئی تھی، اُس وقت اگر "عبادت" کا ترجمہ پرستش نہ کر دیا جاتا، تو اوّل تو غیر خداوندی (غیر قرآنی) حکومت قائم ہی نہ ہو سکتی، اور اگر استبداد کی قوتیں غالب آجاتیں، تو (کم از کم) مسلمان اس پر تو مطمئن نہ ہو جاتا کہ غیر اللہ کی محکومیت اور خدا کی پرستش سے بھی صحیح اسلامی زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ وہ اس غیر اسلامی زندگی سے نکلنے کی کوشش کرتا، اور جب تک اس مقصد میں کامیاب نہ ہو جاتا کبھی اطمینان سے نہ بیٹھتا۔ جب وہ غیر اللہ کی حکومت میں، خدا سے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کہتا تو اُسے جھرجھری آجاتی اور اس کا یہ اعلان، اس کے اس عزم کا اظہار ہوتا کہ جب تک میں حکومت کو اللہ کے لئے خاص نہیں کر لوں گا چین نہیں لوں گا۔ غیر خدائی ماحول میں گھرے ہوئے مسلمان کا رکوع و سجود، اس کے اس عزم کی تکرار ہوتی ہے، جس سے وہ جھوٹے فریب کے پیدا کردہ اطمینان کے پھندے میں نہیں پھنستا۔ وہ "خدا کی عبادت" ــــ یعنی اس کی محکومیت میں زندگی بسر کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اگر اُس وقت (جب ہم میں پہلے پہل غیر خداوندی حکومت قائم ہوئی ہے) عبادت کا قرآنی مفہوم سامنے رہتا تو مسلمان غیر خدائی حکومت پر بھی راضی نہ ہو سکتا۔ لیکن اُس وقت عبادت کے معنی پرستش کر لئے گئے اور اس سے اُسے کامل اطمینان حاصل ہو گیا، اور رفتہ رفتہ، یہ جھوٹا اطمینان، "محکم ایمان" کی شکل اختیار کر گیا۔ اس قدر محکم کہ آج اس مسلمان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اگر اس سے کوئی کہتا ہے کہ "عبادت" سے مقصود پرستش نہیں، خدا کی محکومیت ہے، تو کیا خواص اور کیا عوام، سب اس کے پیچھے یوں پنجے جھاڑ کر پڑ جاتے ہیں، گویا وہ انہیں (معاذ اللہ) اسلام سے کفر کی طرف کھینچ رہا ہے۔ مسلمان اس جھوٹے اطمینان میں اس لئے بھی رہنا چاہتا ہے کہ "پرستش" کے تصور سے "اسلامی زندگی" بڑی آسان ہو جاتی ہے ــــ پرستش کرانے والوں کے لئے بھی اور پرستش کرنے والوں کے لئے بھی ــــ اس قسم کی تن آسانی کی زندگی کون چھوڑنا چاہتا ہے؟ ایسی سستی جنت کون چھوڑنا چاہتا ہے؟ یہ ہے اس کی بنیادی وجہ کہ ہم عبادت کے مروجہ مفہوم سے قرآنی مفہوم کی طرف نہیں آنا چاہتے۔ حضرت علامہ کے الفاظ میں،

خودی کے ضعف سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

اسے ایک مرتبہ پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ عبادت سے مقصود خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہے، پرستش نہیں، تو اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے نزدیک نماز کی محسوس شکل غیر ضروری ہے۔ بالکل نہیں۔ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ

(۱) عبادت کے معنی ہیں خدا کی محکومیت اختیار کرنا، یعنی ایسی حکومت قائم کرنا، اور اس کے تابع رہنا، جس میں تمام فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق ہوں۔

(۲) خدا کی محکومیت اختیار کرنے کے جذبہ کا، محسوس ہیئت میں اظہار، نماز کے اجتماعات میں ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے (بلا تمثیل) جس حکومت کے ماتحت کوئی شخص زندگی بسر کرے، اس کے جھنڈے کو سلامی دینا۔

(۳) اگر محکومیت اختیار کر لی جائے غیر اللہ کی، اور پرستش کر لی جائے خدا کی، تو یہ ایسے ہی ہے جیسے محکومیت اختیار کر لی جائے بھارت کی حکومت کی اور سلامی دیتے رہیں پاکستان کے جھنڈے کو۔ اگر کبھی ایسی صورت ہو کہ حکومتِ خداوندی قائم نہ ہو، تو اس وقت خدا کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا مطلب، خدا سے یہ عہد و پیمان کرنا ہوگا کہ ہماری زندگی کا مقصود تیری حکومت قائم کرنا ہے۔ اور پھر اس کے لئے حتی الامکان کوشش بھی کرنا۔ جب فرعون کی محکومیت میں بسنے والے بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ تم "اپنے گھروں کو قبلہ بنا لو" تو اس سے یہی عہد و پیمان مقصود تھا ——— اور یہ پہلا قدم تھا فرعون کی محکومیت سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کا۔ یہی صورتِ حال، نبی اکرمؐ کی مکی زندگی میں تھی۔ اس وقت مؤمنین کی یہ مختصر سی جماعت، اپنے رب کے سامنے اپنے اس عزم کا اظہار کرتی تھی کہ وہ اس کی حکومت کے قیام کے لئے اپنی زندگی وقف کر رہے ہیں۔ یہی ان کے رکوع و سجود سے مفہوم تھا۔ لیکن جب مدینہ میں حکومتِ خداوندی کا قیام عمل میں آگیا تو پھر مکہ میں رہنے والے مسلمانوں سے کہہ دیا گیا کہ اب تمہارے لئے، غیر خداوندی ماحول میں زندگی بسر کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں۔ چنانچہ ان کے لئے ہجرت کو ایمان کی نشانی قرار دیا گیا حالانکہ وہ وہاں بدستور نمازیں پڑھتے تھے۔

آپ نے اس ایک مثال سے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی کسی ایک اصطلاح کا مفہوم بدل جانے سے، کس طرح دین کا پورے کا پورا نقشہ بدل جاتا ہے اور زندگی کی گاڑی کس طرح کسی اور ہی پٹڑی پر جا پڑتی ہے۔

قرآنی اصطلاحات و تصورات کے مفہوم میں اس قسم کی تبدیلی اس کی کسی ایک اصطلاح ہی میں نہیں ہُوئی بلکہ بکثرت ایسا ہُوا ـــــ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم ایک ایسی ناقابل تقسیم وحدت (Indivisible unit) ہے کہ اس کے کسی ایک گوشے (یا تصور) کی تبدیلی سے، ساری تعلیم کا تصور بدل جاتا ہے۔

اس سے آپ نے یہ دیکھ لیا ہوگا کہ ہم کبھی صحیح اسلامی زندگی تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب تک قرآنی اصطلاحات و تصورات کے مرّوجہ مفہوم کو صحیح قرآنی مفہوم سے نہیں بدلا جاتا۔ ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ کہ اس تبدیلی کے ذمہ دار کون تھے اور یہ اتنا عرصہ تک علیٰ حالہٖ قائم کس طرح رہی۔ خدا کی کتاب ہمارے سامنے ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اُس کی اصطلاحات و تصورات کا مفہوم اُسی سے پوچھ کر، از سر نو مرتب کرلیں۔ ہمارا دور اس اعتبار سے بڑا مبارک و مسعود ہے کہ اس میں نہ صرف اس کام کی اہمیت کا احساس بیدار ہو رہا ہے بلکہ اس کے لئے عملی قدم بھی اٹھایا جا چکا ہے۔ لغات القرآن اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں قرآنی تصورات کو صحیح قرآنی روشنی میں مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے لئے فلاح و سعادت کی، اس کے سوا کوئی اور راہ نہیں۔ خدا کی کتاب قیامت تک کے لئے محفوظ ہی اس لئے رکھی گئی تھی کہ ہم اس کی روشنی میں ایک ایک قدم پر جائزہ لیتے جائیں کہ ہم نے صحیح راستہ تو نہیں چھوڑ دیا۔ اور جونہی محسوس ہو کہ فلاں قدم غلط اُٹھ گیا ہے اُسے صحیح سمت کی طرف موڑ لیں۔ مرّوجہ تصورات کو قرآنی تصورات کے مطابق کر لینا اپنے رُخ کو قبلے کی سمت موڑ لینے کے مرادف ہے۔

سلیم کے نام خطوط

ہمارے نوجوان تعلیمیافتہ طبقہ کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا انہیں کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ ان کا جواب ان خطوط میں ملے گا۔ یہ اپنے انداز کی نرالی کتاب ہے جس نے نوجوانوں کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ کی طباعت۔ قیمت:۔ جلد اوّل۔ آٹھ روپے۔ جلد دوم۔ چھ روپے جلد سوم۔ چھ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

الہام اور نبوّت

مؤقر ہمعصر "ایشیا" (لاہور) کی ۱۰ر اگست کی اشاعت میں "مسلم جلالپوری صاحب" کے نام سے، ایک شذرہ شائع ہوا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں:

> "اس دستور العمل کے مؤید من اللہ ہونے کی یہ شان ہے کہ نہ صرف اس کی ترتیب کا غیب سے اشارہ کیا گیا ہے بلکہ بلا مبالغہ ملہم حقیقی (ذات باری تعالیٰ نے بذریعہ الہام) حرف بحرف اس کو لکھوایا ہے۔ جو قیامت تک موجود اور آیندہ آنے والی نسلوں کے لئے جیسے ایک دستور العمل ہے اسی طرح ان کے لئے پیام عمل بھی ہے"۔
>
> (دعوتِ حیات اوّل صفحہ ۴۲)

ایک صحیح العقیدہ مسلمان اس عبارت کو پڑھ کر یقیناً یہ سمجھے گا کہ مذکورہ بالا دستور العمل سے مراد قرآن مجید ہے جس کا حرف بحرف الہامی ترتیب اشارۂ غیب کے مطابق اور قیامت تک شمع ہدایت ہے۔ مگر نہیں "دعوتِ حیات" کے داعی یہاں قرآن کو پیش نہیں کر رہے بلکہ اس "الہامی دستور" سے اُن کی مراد "صیانۃ المسلمین" ہے جو مولانا اشرف علی شاہ تھانویؒ کے "قلب صافی پر القا فرمائی گئی"۔ کیونکہ "اس زمانے کے کثیر التعداد اولیا و اقطاب، علما و صلحا کا اس پر اتفاق ہے کہ موجودہ صدی کا مجدد حق تعالیٰ نے ...... محمد اشرف علی تھانویؒ کو بنایا ہے" جن کا "ہر وعظ الہامی ہے"۔ جن کی شان "حضرات صحابہؓ اور حضور نبی کریمؐ کی شانوں کے ساتھ "مشابہ ہے۔ ایسے مجدد کے منکر" بد اعتقاد برکاتِ باطنی سے محروم" اور جو اس سے عداوت رکھے۔ اس کی سب سے زیادہ قیمتی چیز اور اس کا مرکز "ایمان" اس سے چھین لیا جاتا ہے" (صفحہ ۴۳) "آپ سے پہلے مسلمانوں نے دین کی صورت خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی" (صفحہ ۱۳)

یہ ہے وہ جذبۂ شخص پرستی اور غیر محتاط انداز بیان جس نے اس سے پہلے کئی فتنوں کو جنم دیا اور ایک نئے فتنے کو اپنی آغوش میں پال رہا ہے۔

محترم مقالہ نگار نے جن فتنوں کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کی اصلی وجہ "جذبۂ شخص پرستی اور غیر محتاط انداز بیان" نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ عام عقیدہ ہے کہ وحی کا سلسلہ تو نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ لیکن کشف والہام کا دروازہ کھلا ہے۔ محترم مقالہ نگار نے، اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جب کہا ہے کہ

> شاہ صاحب کے عقیدتمندوں نے فرط عقیدت کی وہ غلط راہ اختیار کر لی ہے جس پر چل کر پہلے بھی شخص پرستوں نے اپنی اپنی محبوب ہستی کو جزو دین بنانے کی کوشش کی اور اس ہستی کے منکرین و مخالفین کو روحانیت و ایمان سے محروم قرار دیا۔ اور الہام والقاء اور غیب کے دروازے کھول کر ظلی اور بروزی نبیوں کے لئے دلائل بہم پہنچائے۔"

لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ "الہام والقاء" وغیرہ کے عقیدہ کے متعلق وضاحت سے بات کی جائے، کیونکہ یہی عقیدہ ان تمام فتنوں کا بنیادی سبب ہے۔ طلوع اسلام میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے قارئین طلوع اسلام اچھی طرح واقف ہیں۔ وحی قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں، اللہ تعالیٰ کا کسی انسان کو براہ راست علم عطا کرنا۔ اس علم میں اس انسان کے اپنے خیالات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جس برگزیدہ انسان کو یہ وحی عطا ہوتی تھی، اسے نبی کہا جاتا تھا۔ اور اس طرح وحی پانے کا نام نبوت تھا۔ نبوت کا یہ سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا، اس لئے خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کا امکان بھی ختم ہو گیا۔ قرآن کریم میں کسی ایک جگہ بھی ایسا نہیں کہا گیا کہ وحی اور نبوت کا سلسلہ تو بند کر دیا گیا ہے لیکن خدا کی طرف سے براہ راست علم ملنے کا راستہ کھلا ہے۔ یہ بذریعہ الہام یا کشف ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی اور الہام میں صرف لفظی فرق ہے۔ ماہیت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ دونوں سے مفہوم، خدا کی طرف سے براہ راست علم پانا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، قرآن کریم میں یہ تصور ہی نہیں ملتا کہ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اور الہام کا دروازہ کھلا ہے۔ ہمارے ہاں یہ تصور بعد کا پیدا شدہ ہے اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا گیا ہے۔ ان کے ہاں اس کے لئے کوئی الگ اصطلاح نہیں تھی، لیکن جب یہ تصور ہمارے ہاں آیا تو اس کے لئے الگ اصطلاح کی ضرورت لاحق ہوئی۔ وہ اس طرح کہ اگر اسے وحی کہا جاتا تو اس کے خلاف شور برپا ہوتا کہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ اسے جاری سمجھنا عقیدۂ نبوت کے خلاف ہے۔ لہٰذا، اس کے لئے وحی سے الگ، الہام کی اصطلاح وضع کی گئی۔ اس سے ہوا یہ کہ باب نبوت پر جو مہر لگ چکی تھی، وہ بھی ٹوٹ گئی، اور

اِسے وحی کا نام دینے سے جو شور اٹھنا تھا' وہ کبھی نہ اٹھا۔ یہ ہے وہ بڑا فتنہ جو اُمت میں پیدا ہوا۔ جب تک ہم' اس غیر قرآنی عقیدہ کو چھوڑ کر' ختم نبوت کے صحیح عقیدہ کی طرف نہیں آئیں گے' ان فتنوں کا سدِباب نہیں ہو سکے گا۔ ختم نبوت کے صحیح عقیدے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو علم براہِ راست دینا تھا' وہ اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر دیدیا گیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اب خدا سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ اور امکان نہیں۔ جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے باتیں کرتا ہے (اس لئے کہ وہ خدا کا کلام ہے)۔ اس کے علاوہ خدا کسی سے باتیں نہیں کرتا۔

۲۔ جب مسلمانوں نے اس عقیدے کو قبول کر لیا (کہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد' الہام کا دروازہ کھلا ہے)' تو پھر ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا اور کہا گیا کہ الہام پانے والے کو نبی بھی کہا جا سکتا ہے۔ جب اس کے خلاف احتجاج ہوا تو کہہ دیا گیا کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ نبیؐ اور رسولؐ میں فرق ہوتا ہے۔ رسول وہ ہے جسے خدا کی طرف سے کتاب (شریعت) ملے اور نبی وہ ہے جو صاحب کتاب نہ ہو۔ لہٰذا' جسے الہام ہو' وہ رسول تو نہیں کہلا سکتا' نبی کہلا سکتا ہے۔

حالانکہ نبی اور رسول میں یہ فرق' قرآن کریم کی واضح تعلیم کے خلاف ہے۔ (اس کے متعلق بھی طلوعِ اسلام میں اس سے پیشتر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے[1])۔ قرآن کریم کی رُو سے نبی اور رسول' ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہی شخص ہوتا تھا جو خدا سے وحی پاتا تھا اور پھر اس وحی کو دوسروں تک پہنچاتا تھا۔ وحی پانے کے منصب کو نبوت کہہ لیجئے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کو رسالت۔ لیکن یہ دونوں منصب ایک ہی ذات کے اندر مدغم ہوتے تھے۔ اس لئے نبی اور رسول میں کچھ فرق نہیں تھا۔ اس لئے قرآن کریم واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ تمام انبیاء صاحب کتاب تھے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ
وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ (۲/۲۱۳)

تمام نوعِ انسان ایک امت ہے۔ سو اللہ نے انبیاء کو بھیجا جو خوشخبری دینے والے اور (غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے) آگاہ کرنے والے تھے۔ اور ان سب کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب نازل کی۔ یہاں "انبیاء" کہا گیا ہے اور دوسری جگہ بعینہٖ یہی الفاظ "رسولوں" کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ سورۂ حدید میں ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے معراجِ انسانیت' باب ختم نبوت۔ یا لغات القرآن' عنوانات رسول اور نبی ملاحظہ کیجئے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ أَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ..... (۵۷/۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی۔ قرآن کریم کی ان تصریحات کے بعد یہ عقیدہ رکھنا (اور دعویٰ کرنا) کہ رسول' صاحبِ کتاب ہوتا ہے اور نبی' صاحبِ کتاب نہیں ہوتا۔ قرآن کے یکسر خلاف ہے۔

لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ بھی آیا اور (اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات سے ہوتی ہے کہ) ایسی ایسی ہستیاں اس کی قائل ملتی ہیں، جن کا نام بصد احترام لیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں، قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب نے' میرزائی حضرات کی ایک کتاب "خاتم النبیین" سے کچھ اقتباسات بھیجے ہیں' جن میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے کتنے کتنے بڑے بزرگوں نے "نبی بلا کتاب" کے عقیدے کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ قارئین کی معلومات کے لئے ہم ان اقتباسات کو درج ذیل کرتے ہیں؛

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا:

قولوا انہ خاتم الانبیاء ولا تقولوا لانبی بعدہٗ (درمنثور جلد ۵ صفحہ ۲۰۴)

تکملہ مجمع البحار، صفحہ ۸۵

کہو کہ آنحضرتؐ خاتم الانبیاء ہیں اور یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ

جب نبوت وہ اشرف اور اکمل مرتبہ ہے جس پر وہ شخص پہنچتا ہے جسے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا ہو تو ہم نے جان لیا کہ شریعت کا لانا ایک امر عارضی ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہم میں حکم ہو کر نازل ہوں[1] گے اور وہ بلاشبہ نبی ہوں گے (فتوحات مکیہ جلد اول صفحہ ۵۷۰)

جس نے اس مقام نبوت کے حامل پر خالی نبوت کا لفظ بولنا اس لئے بند کیا ہے، باوجودیکہ نبوت اس صاحبِ مقام کو حاصل ہوتی ہے تاکہ کوئی خیال کرنے والا یہ خیال نہ کرے کہ اس لفظ کا بولنے والا شریعت والی نبوت مراد لیتا ہے اور اس طرح غلطی میں نہ پڑ جائے۔

(فتوحات مکیہ جلد ۲ صفحہ ۳ و صفحہ ۳)

نبوت مخلوق میں قیامت کے دن تک جاری ہے گو تشریعی نبوت منقطع ہو گئی ہے پس

---

[1] ہم نے اصل عبارت نہیں دیکھی۔ شاید اس میں "حکم ہو کر نازل نہیں ہوں گے" لکھا ہو، کیونکہ عام عقیدہ یہی ہے۔

شریعت، نبوت کے اجزا میں سے ایک جزو ہے (فتوحات مکیہ جلد ۲ صفحہ ۱)

یہ امر محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اخبار غیبیہ اور حقائق و معارف کا علم دیا جانا بند ہو جائے کیونکہ اگر یہ بند ہو جائے تو پھر دنیا کے لئے کوئی روحانی غذا باقی نہ رہے گی۔ جس سے وہ اپنے وجود کو باقی رکھ سکے۔ (فتوحات مکیہ جلد ۲ باب ۷۳، صفحہ ۱۰۰)

نبوت اخبار الٰہی (امور غیبیہ) سے کسی زائد امر کا نام نہیں (فتوحات مکیہ جلد ۲ صفحہ ۳۱۲)

امام ابن سیرین علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے کہ

اس امت میں ایک خلیفہ ہوگا جو ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے بھی بڑا ہوگا۔ قریب ہے کہ وہ بعض نبیوں سے بھی بڑھ جائے (حجج الکرامہ صفحہ ۳۸۶)

شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ لکھتے ہیں کہ

انبیاء کو تو نبی کا نام دیا گیا ہے اور ہم امتی لقب نبوت پاتے ہیں ہم سے النبوۃ کا نام رد کا گیا ہے باوجود اس کے کہ ہمارا حق برابر کا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ ہمیں ہمارے نفس میں اپنے کلام اور اپنے رسول کے کلام کے معانی کی خبر دیتا ہے اور اس مقام کے رکھنے والا انسان انبیاء الاولیاء میں سے ہوتا ہے۔ (الیواقیت والجواہر جلد ۲ صفحہ ۳۵)

امام ابو الحسن موسیٰ کاظم فرماتے ہیں کہ

حضرت علیؓ کی ولادت تمام نبیوں کے صحیفوں میں لکھی ہوئی ہے اور خدا تعالیٰ آئندہ کسی کو ہرگز رسول بنا کر نہیں بھیجے گا سوائے اس شخص کے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے نبوت ملے اور وہ حضرت علی کی وصیت کا قائل ہو (صافی شرح اصول کافی جزو سوم حصہ ۲ صفحہ ۱۴۲)

حضرت امام مہدی اپنے رسول ہونے کا ان الفاظ میں اقرار کرتے ہیں کہ

اے لوگو! جب میں تم سے ڈرا اور اس پر بھاگ گیا تو خدا تعالیٰ نے مجھے حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں سے بنا دیا۔ (اکمال الدین صفحہ ۱۸۹)

جب تک اللہ تعالیٰ کے بندے احکام ماننے کے مکلف ہیں اُس وقت تک انبیاء اور اولیاء کا انقطاع جائز نہیں۔ (اکمال الدین صفحہ ۳۷۵)

امام عبدالوہاب شعرانی تحریر فرماتے ہیں کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول لا نبی بعدی اور لا رسول بعدی سے مراد یہ ہے کہ آپؐ کے بعد شریعت والا نبی نہیں ہوگا۔ (الیواقیت والجواہر جلد ۲ صفحہ ۳۵)

جان لو کہ مطلق نبوت بند نہیں ہوئی صرف تشریعی نبوت بند ہوئی ہے (الیواقیت والجواہر جلد ۲ صفحہ ۳۹)

امام محمد طاہر لکھتے ہیں کہ

یہ قول اس بنا پر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بحیثیت نبی اللہ نازل ہونا ہے۔ نیز یہ قول حضرت عائشہؓ لا نبی بعدی کے خلاف ہی نہیں کیونکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی ایسا نبی نہیں ہوگا جو آپ کی شریعت کو منسوخ کرے (تکملہ مجمع البحار صفحہ ۸۵)

نبراس شرح العقائد نسفی میں یوں درج ہے کہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد تیس آدمی ہوں گے ان میں سے ہر ایک نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ اور میرے بعد کوئی نبی نہیں سوائے اس نبی کے جسے اللہ چاہے۔

(نبراس صفحہ ۴۴۵)

عبدالرزاق کاشانی لکھتے ہیں کہ

مہدی جو آخری زمانہ میں آئے گا وہ احکام شرعیہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوگا اور معارف، علم، اور حقیقت میں تمام انبیاء اور اولیاء سب کے سب اس کے تابع ہوں گے۔ کیونکہ مہدی کا باطن محمد رسول اللہ کا باطن ہوگا۔

(شرح فصوص الحکم مطبوعہ مصر صفحہ ۵۲ و ۵۳)

رسول وہ ہے جس کے پاس کوئی کتاب ہو یا شریعت سابقہ کے بعض احکام کو منسوخ کرے

(شرح مقاصد جلد اول صفحہ ۱۲۸)

علامہ الوسی لکھتے ہیں کہ

"بے شک رسول کے لئے صاحب شریعت جدیدہ ہونا ضروری نہیں کیونکہ اولاد ابراہیم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ہی شریعت پر تھی (روح المعانی جلد ۵ صفحہ ۹۸۶)

حدیث لا وحی بعدی جھوٹی ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ جبریل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

وفات کے بعد زمین پر نازل نہیں ہوگا یہ بے اصل ہے (روح المعانی جلد، صفحہ ۶۵)

علی القاری فرماتے ہیں کہ

نبوت کے مجازی مرتبہ کا دعویٰ کرنا نہ کفر کا موجب ہے اور نہ ہی بدعت ہے۔

(شرح شفا قاضی عیاض جلد ۲ صفحہ ۵۱۹)

عبدالکریم جیلی خاتم النبیین کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

شریعت والی نبوت کا حکم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منقطع ہوگیا ہے اس لئے آپؐ خاتم النبیین ہیں۔ (الانسان الکامل باب ۳۶)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں کہ

خاتم النبیین کے یہ معنی ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی ایسا شخص نہیں پایا جائے گا جس کو خدا تعالیٰ شریعت دے کر لوگوں کی طرف مامور کرے (تفہیمات الٰہیہ تفہیم صفحہ ۵۳)

مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مجرد کسی نبی کا ہونا محال نہیں بلکہ صاحب شرع جدید ہونا البتہ ممتنع ہے۔ (دافع الوساوس صفحہ ۱۶)

اس کے بعد ہمارے یہ دوست لکھتے ہیں۔

احکام الاسلام حصہ دوم از مولوی عبدالشکور صاحب فاضل السنۂ شرقیہ (پنجاب یونیورسٹی) فاضل مظاہر العلوم (سہارنپور) جماعت چہارم کے طلباء کو یہاں سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے اس میں "رسولوں پر ایمان" کے عنوان سے سبق ۲۶ میں بچوں کو یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ

"اللہ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے ایک لاکھ کئی ہزار نبی پیدا فرمائے ہیں جن میں سب سے اول حضرت آدم علیہ السلام ہوئے ہیں جو تمام انسانوں کے باپ ہیں ان کے بعد ہر ایک قوم میں اللہ کے نبی آتے رہے بعض اپنے ساتھ نئی کتاب اور نئی شریعت بھی لائے جو "رسول" کہلائے اور بعض اپنے سے پہلی شریعت کے تابع ہو کر آتے جو نبی کہلائے۔"

(احکام الاسلام حصہ دوم صفحہ ۱۹)

جب بچے اپنے ذہنوں میں اس بیج کو لے کر بڑے ہوتے ہیں کہ جو پہلی شریعت کے تابع ہو وہ نبی کہلاتا ہے تو اس کے بعد علامہ محمد ایوب صاحب دہلوی کی عالمانہ اور فاضلانہ تحریر ان کے سامنے آتی ہے کہ

"مسلمانوں کا بالاجماع اور بالاتفاق یہ عقیدہ ہے کہ نبی صاحبِ کتاب بھی ہوتا ہے اور بے کتاب کے بھی۔ اسی عام عقیدے کے پیشِ نظر قادیانی نے دعویٰ کیا اگر یہ عام عقیدہ نہ ہوتا۔ تو دعوے کرتے ہی لوگ اس کی فوراً تکذیب کرتے اور اس کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ قادیانی نے اس خیال کی تعمیم نہیں کی۔ بلکہ اس سے قبل تمام مسلمانوں میں یہی عقیدہ تھا۔ یعنی نبی بے کتاب کے بھی آیا کرتا تھا۔ (فتنۂ انکارِ حدیث صفحہ ۱۱)

جو حضرات ان بزرگوں کے اقوال کو دین میں سند مانتے ہیں، وہ مرزائی حضرات کے اس اعتراض کا کیا جواب دے سکتے ہیں کہ جب آپ کے ایسے ایسے بزرگ' نبوت بلا شریعت' کے امکان کے قائل ہیں' تو' اگر مرزا صاحب نے اس قسم کے نبی ہونے کا دعویٰ کر دیا' تو ان سے کونسا جرم سرزد ہو گیا؟ —— لیکن جو لوگ دین میں قرآن کریم کو سند مانتے ہیں' ان کے نزدیک یہ دلیل پرِکاہ جتنا وزن بھی نہیں رکھتی' جس عقیدہ کو قرآن کریم غلط قرار دیتا ہے' وہ بالبداہت غلط ہے' خواہ ساری دنیا کے انسان اُسے صحیح کیوں نہ تسلیم کریں!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ان تمام فتنوں کا بنیادی سبب' الہام کا عقیدہ ہے۔ اس سے شخصیت پرستی شروع ہوتی ہے اور اس سے نبوت کا دروازہ کھلتا ہے۔ جب تک مسلمانوں کے ہاں سے یہ غیر قرآنی عقیدہ نہیں جاتا' ان فتنوں کا سدِباب نہیں ہو سکتا۔ یہ عقیدہ اس صورت میں جا سکتا ہے کہ ہم دین کے معاملہ میں' صحیح اور غلط کا معیار خدا کی کتاب کو قرار دیں۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

نظامِ ربوبیت

کیا ایسا [illegible] جس میں کوئی شخص نہ بھوکا ہے نہ ننگا۔ نہ بیمار ہے نہ جاہل' نہ کوئی امیر ہے نہ غریب۔ نہ کوئی قارون ہو نہ بھکاری۔ ایسا ہو سکتا ہے!

کیسے؟ قرآن کے نظامِ ربوبیت سے جس کی بصیرت افروز تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ اس نے نظامِ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ قیمت چار روپے۔

پتہ:- میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷۔بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

صدرِ پاکستان کی حقیقت کشا تشریح

۳۰ جولائی کو، کراچی کے سینٹ پیٹرک اسکول کی صد سالہ برسی کی تقریب پر، محترم صدر مملکت پاکستان نے ایک تقریر فرمائی تھی، اس تقریر سے پہلے، اسکول کے پرنسپل صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہمیں روایات کی شدت سے پابندی کرنی چاہیئے۔ صدر محترم نے، اپنی رسمی تقریر سے ہٹ کر، اس امر کی فی البدیہہ وضاحت فرمائی کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے، دین کے اصولوں میں اور روایات میں کیا تعلق ہے۔ جہاں تک ہمارے علم میں ہے، لاہور کے اخبارات میں اس رقم کا محض ضمناً ذکر آیا تھا اور صدر مملکت کی یہ تصریح پوری کی پوری شائع نہیں ہوئی تھی۔ کراچی کے روزنامہ ڈان میں یہ پوری شائع ہوئی ہے۔ اس تصریح کی اہمیت کے پیش نظر، ہم ذیل میں اس کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔ صدر محترم نے فرمایا۔

"واجب الاحترام پرنسپل صاحب نے اپنی تقریر میں، ایک ایسا اصولی نقطہ بیان فرمایا ہے، جس کے متعلق میں کچھ گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے۔

> ہمیں روایات (Traditions) کا بہت زیادہ احترام کرنا چاہیئے، اور مستقبل کی خاطر، اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ آجکل یہ رجحان عام طور پر پایا جاتا ہے کہ لوگ زمانے کے تقاضوں کے ماتحت، اپنے ماضی کا مذاق اڑاتے ہیں، اور اس بات کا بھی انہیں علم نہیں ہوتا کہ وہ مستقبل میں اخلاقی اور روحانی بنیادوں کے معنی کیا کریں۔

یہ بڑا بنیادی نقطہ ہے۔ یہ درحقیقت ایک اہم بنیادی مسئلہ ہے جو عام مذاہب کو بالعموم، اور عیسائیت اور اسلام کو بالخصوص درپیش ہے، پاکستان میں ہمیں خصوصیت سے اس اہم مسئلہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہماری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس سے پیشتر، جبکہ زندگی۔ یعنی معاشرہ۔ جامد تھا، متحرک نہیں تھا۔ ایسا ممکن تھا کہ آپ آنکھیں بند کئے، قدیم روایات کے مطابق چلتے جائیں اور زندگی کو، انہی کے قالب میں ڈھالے رکھیں۔ ان حالات

تھا، یہ طرزِ عمل صحیح قرار پا سکتا تھا - لیکن اب، جبکہ لوگوں میں تعلیم عام ہو رہی ہے ـــــــ اور پاکستان میں آیندہ پندرہ بیس سال میں تعلیم بالکل عام ہو جائے گی ـــــــ حالات اس سے بالکل مختلف ہو چکے ہیں۔

تعلیم کے معنی کیا ہیں؟ اس سے انسانوں میں کیا تبدیلی واقع ہوتی ہے؟ میرے نزدیک، تعلیم، انسان میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنے لئے آپ سوچے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب انسان خود سوچنے لگ جائے تو اس وقت محض کتبِ مقدسہ اور روایات کے حوالوں سے کام نہیں چل سکتا۔ اس وقت ضروری ہوگا کہ آپ مذہب اور فلسفۂ مذہب کے اصولوں کو پیش کرنے کے انداز میں تبدیلی پیدا کریں، اور انہیں اس زبان میں پیش کریں جو اُس زمانے کے سوچنے والے انسانوں کی سمجھ میں آسکے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ بیشک آپ قدیم روایات کا احترام کریں اور یہ سمجھ لیں کہ کسی خاص زمانے کے لئے وہ کس قدر مفید تھیں، لیکن آپ اپنے آپکو اُن روایات کے ساتھ باندھ نہ لیں۔ اگر آپ نے اپنے آپکو روایات کے ساتھ باندھے رکھا، تو زمانہ آپ کا انتظار نہیں کرے گا۔ وہ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا جائے گا۔ لہٰذا، عیسائیت اور اسلام جیسے مذاہب کے لئے سوچنے کا مقام ہے کہ انہیں زمانے کا ساتھ دینے کے لئے ـــــ یعنی ان لوگوں کے نفسیاتی - ذہنی اور روحانی تقاضوں کی تسکین کے لئے جو آجکل دنیا میں پیدا ہو رہے ہیں ـــــ کیا کرنا چاہیئے؟

میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ تمام اچھے مذاہب کی طرح ـ ان کے ہاں مذہب کے کچھ اصول ہیں اور باقی وہ طریقے ہیں جن کے مطابق ان اصولوں کو (زمانے کے تقاضوں کے مطابق) عمل میں لایا جاتا ہے۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں۔ زندگی کے بنیادی اصول آج بھی وہی ہیں جو آج سے سینکڑوں، ہزاروں سال پہلے تھے۔ لیکن ان پر عمل کرنے کے طریقے بدل چکے ہیں۔ ہمیں اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ آپ ان غیر متبدل اصولوں کو الگ کر لیجئے۔ انہیں ناقابلِ تغیر و تبدل قرار دیجئے۔ اور پھر معاشرہ کو اس کی آزادی دیجئے کہ وہ ان اصولوں کو، دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق، عمل میں لانے کی تدابیر اختیار کریں۔ اگر ان مذاہب نے ایسا نہ کیا تو یہ ڈوب جائیں گے اور کمیونزم ان پر بُری طرح مسلط ہو جائے گی۔

ہم نے گذشتہ چالیس سال میں دیکھا ہے کہ کمیونزم، بدھ مت اور عیسائیت کے سامنے آئی لیکن یہ مذاہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ اب ہماری باری آرہی ہے۔ اگر ہم بھی بیدار نہ ہوئے تو ہمارا بھی وہی حشر ہوگا۔ جو ان مذاہب کا ہوا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ رازِ حیات اسی اصول میں مضمر ہے (جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے)۔ جو لوگ (کمیونزم کے سیلاب میں بہ جانا نہیں چاہتے بلکہ) اپنے روحانی اور اخلاقی ضوابط کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، انہیں ایسا کرنا ہوگا۔ اور جو لوگ مذہبی امور میں ماہر ہیں، انہیں اس باب میں اوروں سے

لوگوں کی راہ نمائی کرنی ہوگی۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو آپ زمانے کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ مادہ پرستی کا سیلاب اُمنڈ آئے گا اور آپ لوگوں کو اس پر کبھی مجبور نہیں کر سکیں گے کہ وہ آپ کی نہج پر سوچیں۔

محترم پادری صاحب! میں نے جو کچھ کہا ہے ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کے نقطۂ نگاہ کے مطابق نہ ہو، لیکن میں چاہتا تھا کہ آپ کے سامنے تصویر کا دوسرا رخ بھی لے آؤں، اور اپنا نقطۂ نگاہ واضح کردوں۔ اس کی ضرورت خاص طور پر اس لئے بھی پیش آئی کہ آجکل پاکستان میں ہمارے سامنے یہی مسئلہ درپیش ہے، اس لئے یہ ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ میں علوم دینیات کا ماہر نہیں ہوں۔ لیکن عمومی فکر کی رُو سے جب میں اس پر غور کرتا ہوں تو میرے سامنے اس مسئلہ کا حل یہی آتا ہے کہ ہمیں غیر متبدل اصولوں کو بدلنے والے طریقوں سے الگ کر لینا چاہیئے۔ لوگوں کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ غیر متبدل اصول کیا ہے۔ اس کے بعد انہیں اس کا موقع دینا چاہیئے کہ وہ ان غیر متبدل اصولوں کو، اپنے زمانے کے مطابق، عمل میں لانے کی تدابیر اختیار کریں۔

اگر آپ نے ایسا کر لیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس قسم کا غیر متبدل اور بحرالعقول مذہب، کامیاب و کامران نہ ہو!

یہ تھا وہ برجستہ جواب جو محترم صدر مملکت پاکستان نے، عیسائی پرنسپل صاحب کے اُس نقطہ کا دیا جسے آجکل فی الواقعہ بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی، کہ اس کے دوسرے دن، بمبئی کے اسقف (آرچ بشپ)، جو غالباً اس تقریب کے لئے خاص طور پر تشریف لائے تھے، صدر پاکستان سے ملنے کے لئے گئے، اور ڈیڑھ گھنٹے تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے کہ مذہب کے مستقل عناصر اور قابلِ تغیر و تبدل اجزا میں امتزاج کس طرح پیدا کیا جائے۔

یہی وہ نقطہ تھا جسے حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے آج سے تیس سال پہلے پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ یورپ کی تباہی کا راز اس میں ہے کہ ان کے ہاں کوئی چیز غیر متبدل نہیں۔ اور مسلمانوں کی بربادی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں ہر چیز غیر متبدل ہے۔ کامیابی کا راز ثبات و تغیر کے امتزاج میں ہے۔ اُس وقت اس سوال کی حیثیت نظری تھی۔ آج اس نے پاکستان میں عملی شکل اختیار کر لی ہے اور اسے غنیمت ہے کہ صدر مملکت نے اس حقیقت کو پا لیا ہے۔ اُن کی ان تصریحات کو دیکھ کر، روحِ اقبال کس قدر نشاط آگیں ہوگی!

جملہ خط و کتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھیئے۔ اور خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

باب المراسلات

۱- عائلی قوانین

عائلی قوانین کے سلسلہ میں، ہمیں ہندوستان کی ایک مسلم خاتون کا خط موصول ہوا ہے۔ جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اس خط میں وہاں کے ایک ہندو جج کے ایک فیصلہ کا خلاصہ بھی دیا گیا ہے۔

ہم اس فیصلہ کو بطور سند یا تائید شائع نہیں کر رہے۔ مقصود اس سے صرف یہ بتانا ہے کہ، اگرچہ غیر مسلم جج کے سامنے وہ شرط نہیں جسے قرآن کریم نے تعدد ازدواج کے لئے بنیادی شرط قرار دیا ہے، (یعنی یتامیٰ کے مسئلہ کا حل) لیکن قرآن کریم کی عائد کردہ دوسری شرط (عدل) کی اہمیت کو اس نے کس قدر محسوس کیا ہے اور اس کی خلاف ورزی کے اثرات کو کتنی گہری نظر سے بھانپا ہے۔ اس سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ اب قرآن کریم کی آواز اس طرح فضا میں پھیل رہی ہے کہ غیر مسلم اذہان تک بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اب بحمدہٗ قرآن کا دور آنے والا ہے — یہ بہت جلد آ جاتا اگر ہمارا قدامت پرست طبقہ اس کا راستہ روک کر کھڑا نہ ہو جاتا۔

(طلوع اسلام)

خط

حکومت پاکستان نے قرآن کے دیئے ہوئے حقوقِ نسواں کے پیش نظر جو عائلی قانون بنایا اور نافذ کیا ہے۔ اور، شریعت کی خدمت کہہ کہہ کے دھڑا دھڑ بیویاں کر کے مسلمان مجبور عورتوں پر ظلم عظیم ہونے کا جو سدِّ باب کیا ہے، اس پر ہمارا قدامت پرست طبقہ آگ بگولا ہے۔ لاہور ہائیکورٹ کے ایک جج نے بھی اپنے فیصلہ مصدرہ ۱۸ جولائی ۱۹۶۰ء میں ایک مظلوم مسلمان عورت پر اس کی بچیوں کو اس سے چھین لینے کے خلاف جو فیصلہ دیا اور قرآن کو واحد ذریعۂ ہدایت اور تنہا ضابطۂ حیات بتاتے ہوئے ایک فقہی مسئلہ کو رد کر دیا ہے، اس پر بھی یہ طبقہ حد درجہ برافروختہ نظر آ رہا ہے۔ تماشا یہ ہے کہ پاکستان کے اس طبقہ سے زیادہ ہندوستان کا یہ طبقہ زیادہ غضبناک ہو رہا ہے۔ چنانچہ "سیاست جدید" (کانپور) نے بھی اپنے ایک ایڈیٹوریل میں ان تمام خالص قرآنی قوانین کے نفاذ کو، پرویز و "طلوع اسلام" کی حد سے بڑھی ہوئی گمراہی اور فتنہ انگیزی[1] کا نتیجہ قرار دے کر

"[1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔"

لکھا ہے کہ :-

" عائلی قانون کا یہ آرڈی ننس اور اس قبیل کی اور بہت سی چیزیں جن کی توقع ایک اسلامی مملکت میں نہیں کی جا سکتی تھی، بڑی حد تک اس پرویزی فتنہ کا نتیجہ ہیں۔"

(۵ر جون ۱۹۶۱ء)

ہم حیران ہیں کہ ہندوستان کا قدامت پرست طبقہ[1] آج پاکستان کے لاہور ہائیکورٹ کے ایک روشن ضمیر مسلمان جج کے فیصلہ کو، جو ۱۲ر جولائی ۱۹۶۳ء کو صادر ہوا تھا، خلاف شریعت بتا کر اچھل کود رہا ہے، مگر اس سے ٹھیک چھ ماہ پہلے جب ہندوستان کے الہ آباد ہائیکورٹ کے ایک ہندو جج نے ۱۱ر جنوری ۱۹۶۰ء کو ایک اہم عائلی مسئلہ میں ایک طویل فیصلہ دیا تھا تو اس کے خلاف نہ کوئی جلسہ کرنے کی انہیں ہمت ہوئی تھی اور نہ اخباروں ہی نے اس کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت کی تھی۔

ابھی کچھ دن تک ان حضرات کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی کہ صدیوں سے جو انہوں نے قرآن کی روشنی کو موٹے موٹے جزدانوں میں بند کر رکھا تھا اور عورتوں کے حقوق غصب کر رکھے تھے، اس کی مدت ختم ہو چکی ہے اور اب قرآن کی روشنی کو پھونکوں سے یہ حضرات نہ بجھا سکیں گے۔ اب اس کے نور سے صرف مسلمان اہل فکر و ایمان ہی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں بلکہ صاحب نظر و دماغ ہندو بھی قرار واقعی استفادہ کر کے لوگوں کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے جس فیصلہ کا ذکر کیا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

اپیل کنندہ اتواری کا نکاح ۱۹۵۰ء میں سماۃ اصغری کے ساتھ ہوا تھا کچھ عرصہ کے بعد اتواری نے ایک دوسری عورت سے تعلق قائم کر لیا جس کے نتیجہ میں میاں بیوی کے درمیان ناچاقی پیدا ہو گئی اور اتواری نے اصغری کے ساتھ بدسلوکیاں شروع کر دیں اور ایک دن اتواری نے اصغری کو مار پیٹ کر گھر سے بے سروسامان نکال دیا۔ اصغری اپنے میکے چلی گئی تو اتواری نے اس عورت سے شادی کر لی اور اسے اپنے گھر لے آیا۔ اصغری نے چند سال کے بعد غربت و افلاس سے مجبور ہو کر گذارہ کے لئے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۴۸۸ کے تحت درخواست داخل کی۔ اس کی کاٹ میں اتواری نے ایک نیا مقدمہ اصغری کے خلاف منصف کے یہاں دائر کر دیا اور استدعا کی کہ عدالت اصغری کو

گذشتہ صفحے کا فٹ نوٹ نمبر ۱

[1] ہندوستان کا یہ قدامت پرست طبقہ (اور خود پاکستان میں بھی اس طبقہ کا بیشتر حصہ) وہ ہے جو تحریک پاکستان کا مخالف تھا اور جسے اس زمانے میں طلوع اسلام کے ہاتھوں شکست فاش ملی تھی۔ یہ طبقہ طلوع اسلام کو گالیاں دے کر اپنی اس آتش انتقام کے فرو کرنے کی بھی سعی لاحاصل کرتا ہے۔ (طلوع اسلام)

بیوی کی حیثیت سے اُس کے ساتھ رہنے پر مجبور کرے۔ اتواری نے اصغری کے باپ اور دو بھائیوں کو بھی مدعا علیہ بنایا۔ منصف نے اپنے فیصلے میں اس امر پر تو تعجب کا اظہار کیا کہ جب اتواری نے دوسری شادی کر لی تھی تو اصغری نے فسخ نکاح کی درخواست کیوں نہیں دی، جبکہ دوسری شادی کرنے کے بارے میں شوہر کا فعل پہلی بیوی کے لئے اِس بات کی اچھی بنیاد ہے کہ بیوی فسخ نکاح کے لئے دعوے دائر کرے، مگر منصف نے اتواری کے حق میں ڈگری دیتے ہوئے لکھا کہ اصغری یہ ثابت کرنے میں ناکام رہی کہ واقعتاً اس کو جسمانی اور ذہنی تکلیف پہنچائی گئی اور اس کے ساتھ بدسلوکی کی گئی۔ منصف کے خیال میں محض اس حقیقت سے کہ شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے، یہ مفروضہ نہیں قائم کیا جا سکتا کہ اصغری کے ساتھ اتواری کے ہاتھوں غیر منصفانہ سلوک ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اصغری کو ہدایت کی کہ وہ اتواری کے ساتھ جا کر رہے اور اصغری کے باپ اور بھائیوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ اصغری کو اتواری کے پاس جانے سے نہ روکیں۔

اصغری نے اس فیصلے کے خلاف ڈسٹرکٹ جج رامپور کے یہاں اپیل کی۔ جج نے منصف کے فیصلے کو غلط قرار دیتے ہوئے اتواری کے دعوے کو حرجہ کے ساتھ خارج کر دیا۔ جج نے فیصلہ میں لکھا کہ اتواری نے اعادۂ حقوق زناشوئی کے لئے جو دعویٰ دائر کیا تھا وہ اصغری کے اس دعوے کے جواب میں تھا جو اُس نے گزارہ کے لئے دائر کیا تھا۔ جج نے یہ بھی لکھا کہ اگر اتواری واقعی اصغری کو اپنی بیوی کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھنے کا خواہشمند تھا جیسا کہ اب اس مقدمہ میں ظاہر کرتا ہے، تو جب اصغری اس کے پاس سے میکے چلی گئی تھی اور کئی سال سے اپنے والدین کے پاس رہ رہی تھی تو اتواری نے اُس کے واپس لانے کے لئے کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟ یہ طویل خاموشی ہی اس بات کی دلیل ہے کہ درحقیقت اُسے اصغری کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ لہٰذا عدالت اصغری کی اس دلیل کو ماننے پر مجبور ہے کہ اتواری گزارہ کی ادائیگی سے بچنے کے لئے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ اُسے اپنے گھر واپس لانا چاہتا ہے۔ جج نے یہ بھی لکھا کہ جس بیوی کو چھوڑ دیا گیا تھا اور جس کی کئی برسوں تک اس کے شوہر نے پرواہ نہیں کی تھی، وہ اگر اُس گھر میں جہاں ایک اور بیوی آ کر جم گئی ہے زبردستی واپس لائی گئی تو اُسے سکون اور چین مل ہی نہیں سکتا۔ اور اگر اُس کو اس امر پر مجبور کیا جائے تو یہ اُس کے ساتھ ظلم ہوگا۔ لہٰذا اصغری کو عدالت ایسے شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی جس کا دل اُس کی طرف سے جدا ہو۔

اتواری نے جج کے اس فیصلہ کے خلاف الٰہ آباد ہائیکورٹ میں اپیل کی۔ اتواری کے وکیل مسٹر این۔ اے کاظمی نے اپیل کی تائید میں سب سے مضبوط گراؤنڈ یہ پیش کیا کہ محض یہ حقیقت، کہ شوہر دوسری بیوی لے آیا ہے، بے رحمی کا کوئی ثبوت نہیں فراہم کرتی، کیونکہ ہر مسلمان کو زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنے کا حق حاصل ہے اور

ڈسٹرکٹ جج رامپور نے جو رائے قائم کی ہے وہ قانونی اعتبار سے غلط ہے۔ یہ اپیل الہ آباد ہائیکورٹ کے ایک ہندو جج مسٹر دھون کے اجلاس میں زیر سماعت آئی۔ جج موصوف نے ایک لمبا فیصلہ دیا اور اتواری کی اپیل مع خرچہ ڈسمس کرتے ہوئے ڈسٹرکٹ جج رامپور کے فیصلہ کو بحال رکھا۔ یہ فیصلہ اس اعتبار سے بڑا اہم اور غالباً منفرد ہے کہ ایک ہندو جج نے اپنے فیصلہ میں قرآنی آیات پیش اور نقل کرتے ہوئے اُن کی اسپرٹ سے بحث کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ فاضل وکیل اپیلانٹ نے بڑی زوردار بحث کی ہے کہ مسلمان شوہر کو اس کے پرسنل لاء کے تحت یہ حق پہنچتا ہے کہ پہلی شادی کے برقرار رہتے ہوئے بھی، وہ دوسری بیوی لے آئے۔ لیکن اس مقدمے میں یہ حق متنازعہ فیہ نہیں ہے۔ عدالت کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ آیا شوہر کو، ایک بیوی رہتے ہوئے، دوسری بیوی لانے کا حق حاصل ہے یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ آیا اس عدالت کو انصاف اور عدل گستری کے طور پر، شوہر کو امداد دینے کے لئے پہلی بیوی کو مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ دوسری بیوی کی موجودگی میں بھی اُس کے ساتھ رہے ورنہ اُسے جیل بھیجدیا جائے گا؟ جسٹس دھون نے لکھا کہ مسلم لاء نے تعدد ازدواج کی اجازت تو دی ہے لیکن کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے۔ شوہر کا مؤقف یہ ہے کہ ہر مسلمان کو اُس کے پرسنل لاء کے تحت یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بیک وقت زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس دلیل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ مسلمانوں میں تعدد ازدواج قرآن کے چوتھے پارے میں ملتی ہے جو یوں ہے۔ اس کے بعد جسٹس دھون نے قرآن کی آیت مع ترجمہ نقل کی ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ یہ حکم دراصل ایک بندش کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعے بیک وقت رکھی جانے والی بیویوں کی تعداد چار کر دی گئی ہے۔ اس طرح ازدواجی ہوس رانی کی، جو مردوں میں بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے، ایک حد مقرر کر دی گئی ہے۔ چار بیویاں رکھنے کی اجازت کے ساتھ شوہروں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ کئی بیویوں کے درمیان غیر جانبدار نہیں رہ سکتے کہ وہ ایک ہی بیوی پر قناعت کریں۔ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستان میں مسلم لاء ایسے شوہر کے خلاف، جو دوسری بیوی لے آئے، پہلی بیوی کو اس صورت حال کا سامنا ہو کہ اُسے ایک دوسری عورت کے ساتھ اپنے شوہر سے ازدواجی رفاقت میں شریک ہونا پڑے تو وہ بالکل بے بس ہو۔ مسلم لاء تعدد ازدواج کو ایسی روایت قرار دیتا ہے جسے برداشت تو کیا جا سکتا ہے لیکن اُس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی۔ ہندوستان کے موجودہ سماجی حالات میں اگر کوئی مسلمان شوہر پہلی شادی کو برقرار رکھتے ہوئے دوسری شادی کر لے تو اُس سے یہ خیال پیدا ہوگا کہ پہلی بیوی کے ساتھ بے رحمی ہو رہی ہے اور عدالت کے لئے یہ بات نامناسب ہوگی کہ وہ پہلی بیوی کو اُس کی خواہش اور مرضی کے خلاف شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرے۔ کیونکہ شوہر کی اس خواہش کو، کہ وہ دو بیویوں سے تعلقات قائم رکھے، ازدواجی

تعلقات کی ہوس رانی ہی کہا جا سکتا ہے جسٹس دھون کا خیال ہے کہ قرآن نے شوہر کو اس کا کوئی حق نہیں دیا ہے کہ وہ پہلی بیوی کو اس بات پر مجبور کرے کہ بعد میں آنے والی بیویوں کے ساتھ مل کر وہ اس کے ساتھ ازدواجی رفاقت میں شریک ہو۔ جسٹس دھون نے لکھا ہے کہ مسلم فلسفۂ قانون نے، محمڈن لاء پر عمل درآمد کے سلسلے میں سماجی حالات کی تبدیلی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔ مسلم معاشرہ کبھی ساکن یا جامد نہیں رہا۔ اس کی تردید کرنا، مسلم تہذیب کے کارناموں کے ریکارڈ اور مسلم ممالک میں مسلم فلسفۂ قانون کی ہمہ گیر ترقی کے ریکارڈ سے انکار کرنے کے مترادف ہوگا۔ جسٹس دھون نے اپنی دلیل کی تائید میں سر عبدالرحیم کا یہ قول بھی پیش کیا ہے کہ "عدالت کو محمڈن لاء پر عمل درآمد کرانے کے سلسلے میں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حقیقی زندگی کے حالات اور لوگوں کی عادتوں اور رہن سہن میں ہونے والی تبدیلیوں کو کو بھی ذہن میں رکھے"۔ جسٹس دھون نے کہا ہے کہ از روئے قرآن تمام بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہیئے مگر کئی مسلم قانون دانوں کی رائے میں یہ ایک ناممکن العمل[1] شرط ہے۔ آج مسلمان عورتیں سماج میں چلتی پھرتی ہیں اور کئی بیویاں رکھنے والے شوہر کے لئے ناممکن بات ہے کہ وہ سب کو ساتھ باندھے رکھے۔ اُسے مجلسی زندگی کے لئے ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح جدید حالات میں تعدد ازدواج کے تحت غیر جانبدارانہ سلوک اور برتاؤ عملی طور پر ناممکن ہے۔ شوہر کے وکیل کی اس دلیل کو نامنظور کرتے ہوئے کہ، پہلی بیوی کو کسی حالت میں یہ سوچنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ دوسری شادی بے رحمی کا فعل ہے، جسٹس دھون نے کہا کہ میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کے سماجی حالات اور عادتوں میں کافی تبدیلی ہوگئی ہے۔ آج دوسری بیوی گھر میں لائی جائے تو اس کا مطلب عام طور پر پہلی بیوی کی سخت توہین ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلی بیوی پر انگلیاں اٹھتی ہیں اور سماج خود بخود اُسے نیچے گرا دیتا ہے۔ اگر پہلی بیوی کو بدلے ہوئے اُن حالات میں شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا گیا تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس کے دماغ پر اس کا بُرا اثر پڑے۔ آج کے حالات میں کسی شوہر کو یہ بہانہ کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اُسے نہیں معلوم تھا کہ اُس کی کارروائی کا پہلی بیوی کے جذبات اور صحت پر ایسا بُرا اثر پڑے گا۔ نہ صرف اتنا بلکہ دوسری شادی کی ازدواجی مسرتوں کو بھی اس سے زیادہ دھکا اور کسی بات سے نہیں پہنچ سکتا کہ نئی بیوی سے کہا جائے کہ وہ اپنی مسرتوں میں، پُرانی بیوی کو بھی حصہ دار بننے دے۔ لہٰذا دوسری بیوی بھی اپنے شوہر کی اس کارروائی کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھے گی کہ وہ اپنی پُرانی بیوی کو مجبور کرے کہ وہ واپس آکر ازدواجی تعلقات پھر قائم کرے۔

---

[1] جذبات کی مساوات ناممکن العمل ہے۔ برتاؤ کی مساوات نہیں۔ (طلوع اسلام)

جسٹس دہتون کا فیصلہ طویل ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اُسے تمام تر نقل کیا جائے۔ تاہم اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کا علم و فکر بڑھ رہا ہے۔ سوائے ہمارے قدامت پرست طبقہ کے۔　　　والسلام

***

۲- دوسرا خط

عائلی قوانین کے سلسلہ میں کراچی سے ایک صاحب کا خط موصول ہوا ہے۔ خط انگریزی میں ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"بِللہ الحمد کہ عائلی قوانین کے سلسلہ میں، آپ کی سالہا سال کی کوشش بڑی حد تک کامیاب ہو گئی۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ آپ نے اس سلسلہ میں جو خدمت سرانجام دی ہے اس کا صحیح اندازہ آنے والا مؤرخ کر سکے گا۔ یہ قوانین، مظلوم یتیموں اور بےبس عورتوں کی جس قدر دادرسی کریں گے، اسے اپنی جگہ بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن میرے نزدیک، اس سے بھی زیادہ اہم، دو ایک اور گوشے ہیں جنہیں درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(۱) جب سے اسلام کی گاڑی دوسری پٹڑی پر پڑی، ہمارے ہاں پرسنل لاز (شخصی قوانین) اور پبلک لاز (ملکی قوانین) میں تفریق ہو گئی۔ یہ تفریق اسلام کی روح کے بالکل خلاف تھی۔ لیکن اسے ایسا مسلمات میں سے تسلیم کر لیا گیا کہ اس کے خلاف کسی نے انگلی تک نہیں اُٹھائی۔ حتیٰ کہ اس تفریق کو ۱۹۵۶ء کے آئین پاکستان کے اندر داخل کر دیا گیا۔ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس تفریق کو مٹا دیا گیا ہے۔ کتنی بڑی ہے یہ تبدیلی۔!

(۲) مسلمانوں میں فرقوں کی حد بندیاں اس قدر مضبوط ہو چکی ہیں کہ ان کا مٹنا امر محال نظر آتا ہے۔ چنانچہ جو حساس دل اس صورت حالات پر غور کرتا، وہ سرد آہ بھر کر بیٹھ جاتا کہ یہ حد بندیاں اب کسی صورت میں نہیں ٹوٹ سکتیں۔ آپ نے اس مایوسی میں امید کی کرن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آپ کا پمفلٹ (فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں) اس کوشش کا مظہر تھا۔ اس میں آپ نے بتایا تھا کہ اگر قرآنی حکومت قائم ہو جائے تو فرقے مٹ سکتے ہیں اس کے لئے آپ نے (دو فیکمر رسول) کی قرآنی دلیل پیش کی تھی۔ دلیل تو بہت قوی تھی لیکن اس پر بھی اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ عائلی قوانین نے آپ کی اس خوش امیدی کو واقعہ میں تبدیل کر دیا۔ ان قوانین کے متعلق اعلان ہے کہ ان کا اطلاق مختلف فرقوں پر الگ الگ نہیں ہوگا بلکہ تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ حالانکہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں یہ بھی درج تھا کہ پرسنل لاز میں "کتاب و سنت" کی تعبیر ہر فرقہ کی اپنی اپنی ہوگی۔ اس ایک اقدام سے کم از کم اس گوشے میں فرقوں کی تفریق کے بجائے امت کی وحدت پیدا ہو گئی۔ اس سے یقین ہو گیا کہ اگر قرآن کے مطابق قوانین نافذ ہو جائیں تو فرقے مٹ سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں آپ کی

کوششیں ایسی ہیں جن پر ہم ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی فخر کریں گی۔ آپ پر خدا کی رحمت ہو۔ والسلام

طلوع اسلام قرآنی احباب کی طرف سے اس قسم کی حوصلہ افزائی سے، ہمارا سر بحضور رب العزت اور زیادہ جھک جاتا ہے جس نے ہماری ناچیز سی کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ ہم اپنے مخلص احباب کے بھی شکر گزار ہیں جن کے تعاون سے ہم اس حد تک پہنچ سکے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اگر ہم اپنی کوششوں کو جاری رکھیں گے تو فضا، قرآنی تعلیم کو اپنانے کے لئے اور سازگار ہو جائے گی۔ ہمارا اس میں اتنا ہی حصہ ہے، ورنہ حقیقی شکریہ کی مستحق تو وہ حکومت ہے جس نے مروجہ قوانین کو قرآن کے مطابق مرتب کرنے میں یہ پہلا قدم اٹھایا ہے۔

۳۔ قرآنی قوانین

ایک صاحب دریافت کرتے ہیں:

آپ اکثر و بیشتر لکھتے رہتے ہیں کہ جب قرآنی قوانین کا نفاذ ہوگا تو ان کے خوشگوار نتائج کو دیکھ کر، ایک دنیا اسلامی نظام کی طرف لپک کر آئے گی۔ اسلامی قوانین کے متعلق ہمیں تو اتنا ہی بتایا جاتا ہے کہ زانی کی سزا سو درّے ہوگی اور چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ کیا اتنی سی تبدیلی کے نتائج ایسے ہوں گے کہ دنیا اس نظام کی طرف کھنچ کر آجائے گی؟ اگر یہ نہیں تو آپ ایک دو مثالیں دیکر سمجھائیں کہ وہ قوانین کس قسم کے ہوں گے۔ نیز ایک آدھ مثال سے یہ بھی بتائیے کہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصول کس قسم کے ہیں اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہر دور کا اسلامی نظام کس قسم کے قوانین بنانے کا مجاز ہے۔

طلوع اسلام آپ نے جو مثالیں دی ہیں وہ تعزیرات (سزاؤں) کی ہیں۔ اگرچہ سزائیں بھی قوانین کا ایک حصہ ہوتی ہیں، لیکن جن قوانین کے عالمگیر، پُرکشش، انسانیت ساز خوشگوار نتائج کا ہم ذکر کرتے رہتے ہیں، ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایک مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ اسی سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ غیر متبدل اصول کسے کہتے ہیں اور ان کی روشنی میں قوانین کیسے مرتب ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے تمام انسانوں کو واجب التکریم بنایا ہے۔ یہ قرآن کا غیر متبدل اصول یا مستقل قدر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، محض انسانی بچہ ہونے کی حیثیت سے، یکساں طور پر عزت و تکریم کا مستحق ہے۔ دنیا میں اس وقت، عزت اور تکریم کے معیار اضافی ہیں۔ امیر آدمی کے گھر پیدا ہونے والا بچہ، پیدائش کے ساتھ ہی ہزار عزتوں کا مستحق قرار پاجاتا ہے۔ غریب کے بچے کو کوئی بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اونچے محل میں پیدا ہونے والے بچہ کو پہلے ہی دن سینکڑوں

مراعات حاصل ہوتی ہیں، جن سے، جھونپڑی میں پیدا ہونے والا بچہ، یکسر محروم ہوتا ہے۔ عزت اور مراعات کی یہ تفریق و تقسیم، ساری عمر، ان دونوں کے، ساتھ رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عزت، نہ انسان ہونے کی جہت سے ہوتی ہے۔ نہ جوہرِ ذاتی کی بنا پر۔ اسی قسم کی تفریق، سید یا پٹھان کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے، اور جولاہے اور موچی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کے ساتھ چپکی رہتی ہے۔ اونچے اور امیر گھرانے کے بچوں کے لئے ہر قسم کے مواقع (opportunities) کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ غریب گھروں میں پیدا ہونے والے بچے، ان دروازوں کے پاس تک نہیں پھٹک سکتے۔

قرآنی مملکت میں کوئی ایسا قانون یا ضابطہ نافذ نہیں ہو سکتا جس میں، ایک بچے اور دوسرے بچے میں، اس قسم کی اضافی نسبتوں کی بنا پر، کسی قسم کی بھی تفریق کی جائے۔ اس میں ایسے قوانین نافذ ہوں گے جن کی رو سے

(۱) ہر انسان کی عزت کی جائے۔ کسی کو، کسی اضافی نسبت کی بنا پر، نہ ذلیل سمجھا جائے۔ نہ ذلیل کیا جائے۔ ہر ایک کی عزتِ نفس کو برقرار رکھا جائے اور سوسائٹی میں مدارج کا تعین، ذاتی جوہروں اور اعمال کی بنا پر کیا جائے۔

(۲) ہر انسانی بچے کو، زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہونے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع میسر ہوں، اور کوئی اضافی نسبت، نہ کسی کو کوئی رعایت دے سکے۔ نہ کسی کے راستے میں روک بن سکے۔

ظاہر ہے کہ ان قوانین کا دائرہ، زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں ہوگا۔ مختلف شعبوں سے متعلق جس قدر قوانین مرتب ہوں گے، ان میں قرآن کے اس غیر متبدل اصول کو مدنظر رکھا جائے گا۔ اور جو قانون، کسی نوعیت سے بھی، اس اصول کے خلاف جائے گا، وہ کالعدم قرار پا جائے گا۔

یہ ایک مثال ہے۔ یہی صورت قرآن کریم کی تمام مستقل اقدار و قوانین کے ضمن میں ہوگی۔ مثلاً اس کا پیش کردہ اصول یہ ہے کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹)۔ انسان صرف اس کا مستحق ہے جس کے لئے وہ محنت کرے: یہ ایک بڑا وسیع۔ جامع اور عالمگیر اصول ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ اس اصول کے ماتحت، اسلامی مملکت میں کوئی فرد، محنت کئے بغیر کچھ نہیں پا سکتا ـــــ البتہ جو شخص محنت سے معذور ہو، وہ اس سے مستثنیٰ ہوگا۔ یا جس شخص کی ضروریات اس کی محنت سے پوری نہ ہوتی ہوں، اس کی کمی پوری کر دی جائے گی (اسے احسان کہتے ہیں) ـــــ لیکن یہ نہیں ہو سکے گا کہ محنت کوئی کرے اور اس کا ماحصل کوئی اور لے جائے۔ اسی طرح قرآن کا مستقل اصول یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ

وِزْرَ أُخْرَىٰ - (۶/۱۶۵)۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یہ اصول بھی بڑا جامع ہے۔ اس کی رُو سے، ہر شخص اپنی اپنی ذمہ داری کو خود سنبھالے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ذمہ داری ایک کی ہو اور اسے لاد دیا جائے کسی دوسرے کے اوپر۔ یا، کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ لہٰذا اس مملکت میں کوئی ایسا قانون نہیں بن سکے گا جس کی رُو سے، کسی نہج سے بھی، اس قسم کی صورت پیدا ہو سکے۔

زمانے کی ضرورتوں کے مطابق، قوانین بدلتے رہیں گے۔ منسوخ ہوتے رہیں گے ان میں اضافے بھی ہوتے رہیں گے۔ لیکن جو قوانین بھی نافذ العمل ہوں گے ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جو ان اصولوں کے خلاف جائے۔

مقصد پیشِ نظر کے ماتحت، ہم صرف انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس قسم کے ہوں گے وہ قوانین جو قرآنی مملکت میں نافذ ہوں گے، اور ان کے نتائج ایسے خوشگوار اور انسانیت کے لئے موجب فلاح و بہبود ہوں گے کہ انہیں دیکھ کر دُنیا اس نظام کی طرف لپک کر آئے گی۔

اِنسان نے کیا سوچا؟

دُنیا کی کسی زبان میں اس انداز کی کتاب نہیں مل سکے گی

اس سوال کا جواب کہ کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا اطمینان بخش حل پیش کر سکتی ہے؟ اگر نہیں کر سکتی تو پھر اس کا علاج کیا ہے؟ افلاطون سے لے کر عصرِ حاضر کے مفکرین، مورخین، سائنسدانوں کی معرکہ آرا کتابوں کے سینکڑوں اقتباسات۔

تقطیع کلاں۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت بارہ روپے۔

ملنے کا پتہ۔ **میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ**

۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

حقوق و عبر

شیعہ حضرات اور قرآن کریم

عام طور پر مشہور ہے کہ شیعہ حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ جو قرآن اس وقت ہمارے پاس ہے وہ محرف ہے۔ ان کے ہاں ایسی چیزیں ملتی بھی ہیں جن سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ ان کا یہ عقیدہ ہے۔ لیکن مقام مسرت ہے کہ انہیں ایسے لوگ بھی ہیں ـــ اور ان کی حیثیت بڑی ذمہ دارانہ ہے ـــ جو یہ بتاتے ہیں کہ شیعوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے اور وہ موجودہ قرآن کو مکمل اور غیر محرف مانتے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے (سید العلماء) السید علی نقی النقوی صاحب (لکھنوی) کی کتاب "مقدمہ تفسیر القرآن" ہے۔ نقوی صاحب کا، شیعہ حضرات کے علمی طبقہ میں جو مقام ہے اس سے ارباب علم واقف ہیں۔ وہ اس کتاب میں لکھتے ہیں:

> قرآن کی اصلیت و حقیقت کے متعلق مسلمانوں میں، باوجود آپس کے ہزارہا اختلافات کے، کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ وہ متفقہ حیثیت سے قرآن مجید کو خداوند عالم کا نازل کردہ تسلیم کرتے ہیں اور اس میں کسی انسان کی ساخت و پرداخت کا دخل نہیں سمجھتے ہیں....
> .... قرآن جب سے مدون صورت کے اوپر مسلمانوں میں منتشر ہوا اس کے ہر ہر لفظ اور جملہ کی جانچ پڑتال ہوتی رہی اور تمام مسلمان اس کی کتابت، تفسیر، تشریح، قرأت کی طرف متوجہ رہے۔ انہوں نے اس کے ذرا ذرا سے خصوصیات، حتیٰ اعراب و طریق ادا وغیرہ کے متعلق ذرہ بینی سے کام لیا اور اس طرح قرآن مجید میں کسی غیر معلوم تصرف یا تحریف کا امکان باقی نہیں رہا جو اس کے استناد و اعتبار کو صدمہ پہنچانے کا باعث ہو

(صفحہ ۹۳ ـــ ۹۲)

انہوں نے "جمع قرآن" کے عنوان سے ایک الگ باب باندھا ہے، جس میں انہوں نے (اس عام خیال کے مطابق جو خود سُنّیوں میں بھی مروج ہے) لکھا ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے وقت، پورے کا پورا قرآن کریم تحریری شکل میں موجود تھا لیکن وہ یکجا ترتیب کے ساتھ کتابی صورت میں مدوّن نہیں تھا (یہ حصہ غلط ہے۔ قرآن کریم، رسول اللہ کی وفات کے وقت، موجودہ ترتیب کے ساتھ مدون شدہ شکل میں موجود تھا۔ اس موضوع پر ہم تفصیل کے ساتھ پہلے لکھ چکے ہیں)۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے طور پر قرآن کریم کا ایک نسخہ ترتیب نزول کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ ازاں بعد،

> جب لڑائیوں میں حفاظ قرآن کی کثیر تعداد قتل ہو گئی اور خوف پیدا ہوا کہ کہیں حاملانِ قرآن کے قتل ہونے کے سبب قرآن کا کثیر حصہ تلف نہ ہو جائے تو اس وقت جمع قرآن کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس خدمت کو زید بن ثابتؓ کے سپرد کیا گیا۔ جو رسالتمآبؐ کے آخری زمانہ کے صحابہؓ میں سے ایک فرد تھے۔ انہوں نے بڑی جانفشانی و عرق ریزی کے ساتھ مختلف صحابہ کرامؓ کے متفرق اجزا سے جو پتھر۔ چمڑے۔ لیف خرما وغیرہ پر تھے، اور نیز ان سے دریافت کر کے، ان کے محفوظات کی مدد سے قرآن مجید جمع کیا۔ اس میں یقیناً کوئی فروگذاشت اور کمی نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ترتیب نزول کے مطابق نہیں تھا۔ (صفحہ ۱۰۳)

اگرچہ ہماری تحقیق کے مطابق، جمع قرآن کا یہ واقعہ صحیح نہیں۔ قرآن کریم اس سے پہلے مرتب و مدون شکل میں موجود تھا۔ لیکن یہاں صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ شیعہ حضرات کے نزدیک، حضرت علیؓ کے مرتب کردہ نسخہ قرآن، اور حضرت زید بن ثابتؓ کے مرتب کردہ نسخہ میں، سوائے نزولی ترتیب کے اور کچھ فرق نہیں تھا، اس کے بعد جناب نقوی صاحب لکھتے ہیں۔

> امیر المومنینؑ کو جو مفادِ اسلامی کے محافظ اور حقیقی ذمہ دار تھے یہ امر نامناسب معلوم ہوا کہ آپ اپنے جمع کردہ قرآن مجید کو اب ظاہر کریں اور دُنیا کے سامنے پیش کریں کیونکہ اس صورت میں یقیناً قرآن مجید کے ایسے اہم مسئلہ میں مسلمانوں کے اندر دو فرقے پیدا ہو جاتے یعنی مسلمانوں کا قرآن بھی ایک نہ رہ جاتا اور دو ہو جاتے۔
>
> آپ کو مفادِ اسلامی کی حفاظت اسی میں نظر آئی کہ آپ جمع قرآن کے سلسلہ میں اُن لوگوں کی قرار داد کو منظور کر لیں اور جس مجموعۂ قرآن پر ان لوگوں کا اتفاق ہو گیا تھا اسی سے آپ بھی اتفاق فرمالیں اور اُس کا امضا فرمادیں۔

اس طرح واقعی و حقیقی اجماع ہو گیا اس قرآن کی حقانیت پر جو بین الدفتین موجود ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا۔

اگر اس قرآن میں جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے کوئی ایسی خرابی کمی یا زیادتی کی ہوتی جو اس کی حقانیت پر اثر ڈالتی تو یقیناً حضرت علیؓ پر یہ لازم تھا کہ وہ اس حقیقت کو آشکار کرتے اور اپنے پاس والے قرآن کو پوری کوشش کے ساتھ ظاہر فرما دیتے اور اس میں ایک دم کی بھی تاخیر جائز نہ سمجھتے اس لئے کہ تقیہ بھی ایسی بات میں جائز نہیں ہے جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے اصل دین و بنیاد مذہب ہو اور جس پر تمام شریعت کی بنیاد قائم ہو۔

امیر المومنینؓ کا صرف سکوت ہی کرنا اس قرآن کے مقابلہ میں جو عام طور سے مسلمانوں میں شائع ہو رہا تھا اس کی حقانیت کی ایک حقیقی و واقعی دلیل ہے۔

اور پھر حضرت کے کلمات کے مطالعہ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے سکوت ہی نہیں فرمایا ہے بلکہ آپ نے اسی قرآن کے اتباع کی دعوت دی ہے اور اسے معاش و معاد کے تمام معاملات میں حجتِ خدا بتلایا ہے۔ نہج البلاغہ میں جو آپ کے ارشادات کا مجموعہ ہے اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے نہج البلاغہ سے کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ ازاں بعد تحریر فرماتے ہیں:

امیر المومنینؓ کے بعد دوسرے ائمہ معصومینؑ بھی برابر اسی طریقہ پر قائم رہے اور باوجود اختلاف ازمنہ و حالات کے اور بہت سے ایسے اوقات کے جن میں تقیہ کا پردہ بہت ہلکا ہو گیا تھا اور زمانہ بیان حقیقت کا پورے طور سے مقتضی تھا انہوں نے برابر اسی قرآن کی تبلیغ و تعلیم کی اور اسی کو خلق خدا کے لئے حجت اور واجب العمل بتلایا، حدیثوں کے صحت و اعتبار کا اسے معیار قرار دیا اور یہ کہا کہ جو حدیث کتابِ خدا کے خلاف ہو وہ ساختہ و پرداختہ اور بالکل باطل ہے۔ یہ حدیثیں اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ ان سے کتب احادیث و اخبار چھلک رہے ہیں۔ اور "تحریف قرآن کی حقیقت" کے آخری حصہ میں ہم نے ان احادیث کے کافی حوالے درج کر دیئے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیعہ برابر ائمہ اہلبیت کے اتباع کا دم بھرتے رہے ہیں۔ ان کا مذہب، ان کے عقائد ان کے مسائل و احکام سب ائمہ اہلبیت کے اقوال

دارشادات پر مبنی قرار پائے ہیں جس کا بعض منصف مزاج اُن کے مخالفوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ ائمۂ معصومین علیہم السلام تو قرآن مجید کو حجت و سند بتلائیں۔ اس سے احتجاج و استناد کریں اُس سے تمسک کرنے اور اُس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت فرمائیں بلکہ اُس کو احادیث کی صحت کا معیار قرار دیں اور شیعہ بحیثیت مذہب اُس کے برخلاف قرآن کی صحت میں شک کریں اور اُس کے اعتبار میں قدح کریں اور اُس میں زیادتی یا کمی کے قائل ہوں جس سے اُس کی سند مشکوک ہو جائے اور وہ قطعی حیثیت سے کلامِ الٰہی باقی نہ رہے۔

ہرگز ایسا نہیں ہے۔ اکابر علمارِ شیعہ جن کے اقوال و تحقیقات کے محور پر تشیع کے آسمان نے گردش کی ہے اُن کے اقوال و تصریحات ان کے خلاف ہیں۔ انہوں نے تصریح کی ہے کہ ہم قرآن مجید میں کسی زیادتی یا کمی کے قائل نہیں ہیں جس سے اُس کی صحت و اعتبار میں کوئی شبہ واقع ہو سکے۔

آخر میں لکھتے ہیں:

ہم نے بارہا اعلان کیا اور پھر اعلان کرتے ہیں کہ ہم قرآن مجید، اسی دونوں دفتیوں کے درمیان والے قرآن میں جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے کسی قسم کا شبہ نہیں رکھتے اور ہم اس کو کلامِ الٰہی، رسول کا اعجاز، اسلام کی سچائی کا نشان اور تمام مسلمانوں کے لئے لازم العمل اور واجب الاتباع سمجھتے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اگر کسی جگہ اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ ملک کا کوئی قانون، قرآن کریم کے خلاف نہیں ہوگا، تو شیعہ حضرات کو اس سے پورا پورا اتفاق ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم ہی وہ واحد مرکز ہے جس پر پوری امت جمع ہو سکتی ہے۔ کس قدر مبارک و مسعود ہوگا وہ دن جب ساری اُمت کا اس مرکزِ حقیقی پر اجتماع ہو جائے، اور یوں ——— بعد از خرابیٔ بسیار ہی سہی ——— ہمارا انجام، ہمارے آغاز سے ہمکنار ہو جائے۔ وکان ذالک علی اللہ یسیرا۔

جمع القرآن

(کیا قرآن کریم کو خود نبی اکرمؐ نے جمع کرا دیا تھا یا اسے بعد میں جمع کیا گیا۔ اس سوال کا مختصر لیکن جامع جواب۔ قیمت ایک روپیہ　　پتہ: میزان پبلیکیشنز۔ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

نقد و نظر

دھتکارے ہوئے انسان

میزان پبلیکیشنز ایک اشاعتی ادارہ ہے جو اس عزم کو لے کر وجود میں آیا ہے کہ وہ بلند پایہ اور پاکیزہ لٹریچر شائع کرے گا۔ اس نے جو تین کتابیں سب سے پہلے شائع کی ہیں ـــــ اور جو اس وقت زیر تبصرہ ہیں ـــــ وہ اس عزم کی صداقت کی دلیل ہیں۔ پہلی کتاب "عفا اللہ" صاحب کے قلم سے ہے۔ عنایت صاحب سے قارئین طلوع اسلام اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے پہلے مضمون "آخری سہارے" نے اس حلقہ میں بڑا ارتعاش پیدا کیا تھا۔ پھر طلوع اسلام کنونشن میں ان کی تقریر، جو بعد میں مجلہ طلوع اسلام میں شائع ہوئی تھی، قارئین کی طرف سے اس مطالبہ کی بنیاد تھی کہ عنایت صاحب اپنے مشاہدات کو تفصیلی طور پر قلمبند کریں۔ زیر نظر کتاب اس تقاضہ کو پورا کرتی ہے۔ عنایت صاحب نے جیل کی دو سال کی زندگی میں جو کچھ مشاہدہ کیا وہ باہر والوں کی نگاہوں میں شاید کبھی بھی نہ آسکتا۔ انہوں نے جیل کی زندگی کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ مجرموں کے سربستہ راز معلوم کئے۔ اس پس منظر کو کرید کرید کر باہر نکالا جس سے ایک عام انسانی بچہ گرہ کٹ، چور، اُچکا، فریب کار، عصمت فروش، ڈاکو اور قاتل بن جاتا ہے۔ انہوں نے، ان مجرموں کے سینے میں جہاں انتقام کی آگ بھڑکتی دیکھی وہاں ان کی آنکھوں میں اشک ندامت بھی چھلکتے ہوئے پائے۔ انہوں نے بڑے بڑے لیڈروں، مذہبی پیشواؤں، قوم کے غمخواروں، امیروں۔ وزیروں کو جیل کے اندر وہ کچھ کرتے دیکھا جس سے ان کی، پردوں کے نیچے چھپی ہوئی شخصیت، عریاں ہو کر سامنے آگئی۔ انہوں نے کوڑوں سے پٹتے ہوئے قیدیوں کی چیخ و پکار سنی۔ انہوں نے پھانسی کے تختے کی طرف جانے والے مجرموں کی زندگی کے آخری لمحات کا مشاہدہ کیا۔ انہوں نے پھانسی دینے والوں کی ذہنیت کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے یہ سب کچھ دیکھا اور ایسے عبرت آموز اور دلچسپ انداز میں ہمارے لئے قلمبند کر دیا کہ وہ ایک طرف طلسم ہوش ربا سے زیادہ دل چسپ مرقع بن گیا اور دوسری طرف گلستان سعدی سے زیادہ سبق آموز۔ اگر معاشرہ نے عنایت صاحب کے

مشاہدات پر سنجیدگی سے غور کیا تو ہمارا خیال ہے کہ اس سے جرائم کے انسداد کی بہت سی راہیں سامنے آجائیں گی۔ میزان پبلیکیشنز نے اس کتاب کی اشاعت سے قوم پر واقعی احسان کیا ہے اور ہم ان کی اس کوشش پر انہیں مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ کتاب ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مجلد ہے۔ اور گرد پوش، جیل سے رہا ہونے والے، دھتکارے ہوئے انسان کی کیفیات کا صحیح آئینہ دار ہے۔ قیمت اس کی صرف پانچ روپے ہے۔

۲۔ اسلام پر کیا گذری؟

اسلام ایک حسین و جمیل اور صاف و شفاف ندی تھی جو دوشِ جبرئیل پر آسمان کی بلندیوں سے زمین کی طرف آئی اور اپنی گہرباشیوں اور بہار آفرینیوں سے کشتِ انسانیت کو رشکِ صد گلستاں بنا گئی۔ یہ اس کا دورِ اولیں تھا۔ اس کے بعد یہ ندی آگے بڑھی تو اس میں غیر اسلامی تصورات کے ندی نالے آکر ملنے شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ اس کا صاف اور پاکیزہ پانی، گدلا ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اب اس کا رنگ، ذائقہ، بو سب بدل چکا ہے۔ یہ ندی نالے کیا تھے جو اس آسمانی ندی میں آکر ملے۔ یہ کہاں سے نکلے تھے۔ کن رستوں کو قطع کرتے ہوئے آگے بڑھے تھے، اور کس کس مقام پر آکر اس عظیم ندی سے ملے تھے، یہ تحقیق بڑی جانفشانی اور جگر کاوی کی محتاج تھی۔ بارے اسے مصر کے عظیم مؤرخ علامہ احمد امین مصری نے اپنے ذمہ لیا اور ایک عمر کی زہرہ گدازی کے بعد، تاریخی تحقیقات کے نادر سلسلہ کی شکل میں قوم کے سامنے پیش کیا۔ اردو داں طبقہ ان کی اس کاوش و کاہش کے ایسے بیش بہا نتائج سے بے بہرہ تھا۔ ادارہ طلوع اسلام نے اس سلسلہ کی پہلی کڑی — فجر الاسلام — کا اردو ترجمہ شائع کر کے، تشنگانِ علم و تحقیق سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور اس کی باقی جلدوں کے ترجمہ کے تقاضے موصول ہونے لگے۔ اب اسی سلسلہ کی دوسری کڑی — ضحی الاسلام — کی جلد اوّل کا ترجمہ، میزان پبلیکیشنز کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ فجر الاسلام ایک ہی جلد میں شائع ہوئی تھی لیکن وہ بہت ضخیم ہو گئی تھی۔ وہ قریب آٹھ سو صفحات پر مشتمل تھی۔ اس دشواری کے پیشِ نظر، ناشرین نے اس جلد کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس کا حصہ اوّل ہے جو ۴۸۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ ترجمہ مولانا عمر احمد عثمانی صاحب کے قلم سے ہوا ہے اور نہایت سلیس اور پاکیزہ ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے۔ اس قسم کی بلند پایہ کتابوں کا اردو زبان میں منتقل ہو جانا، قوم کی خوش بختی ہے۔ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے اور حسین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت اسکی پانچ روپے ہے۔ فجر الاسلام کی قیمت آٹھ روپے تھی۔ اسلام کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو، یہ سلسلۂ تحقیقات اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیئے۔ ایسی کتابیں نوادرات میں سے ہوتی ہیں۔

The Principles Of Law-making In Islam

ایک عام مملکت میں بھی قانون سازی کے اصولوں کا مسئلہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا لیکن اسلامی مملکت میں اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس دین میں مملکت قانون سازی کے معاملہ میں کاملتہً آزاد نہیں ہوتی۔ بلکہ اسے ایک ایسی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کے اختیارات کو استعمال کرنا ہوتا ہے جو کسی کے بدلنے سے بدل نہیں جاسکتی۔ سوال غور طلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کون سے غیر متبدل اصول و قوانین ہیں، جن کے اندر رہتے ہوئے یہ مملکت اپنے معاملات کے فیصلے کرتی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے ادارۂ طلوع اسلام نے اس اہم مسئلہ سے متعلق ایک مختصر، لیکن نہایت اہم کتاب شائع کی تھی جس کا عنوان تھا۔ اسلام میں قانون سازی کا اصول ـــــ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کے انگریزی ایڈیشن کی اشاعت کے تقاضے شروع ہو گئے تھے۔ اب میزان پبلیکیشنز نے اس کا انگریزی ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس میں لبنان کے ڈاکٹر صبحی محمصانی، ترکی کے پروفیسر حفظی تیمور امریکہ کے ڈاکٹر مجید الخدری کے ان مقالات کے علاوہ جو انہوں نے پرنسٹن۔ یونیورسٹی (امریکہ) کے کلوکیم میں پیش کئے تھے، پرویز صاحب کا وہ اہم مقالہ بھی شامل ہے جسے انہوں نے اس مقصد کے لئے خاص طور پر لکھا تھا۔ انگریزی داں طبقہ کو، اس اہم موضوع کے اسلامی گوشے سے متعارف کرانے کے لئے میزان پبلیکیشنز کی یہ کوشش بڑی مبارک ہے۔ کتاب صوری حیثیت سے بھی بڑی پاکیزہ ہے۔ قیمت مجلد مع ڈسٹ کور صرف دو روپے ہے۔

یہ تینوں کتابیں۔ میزان پبلیکیشنز۔ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور سے مل سکتی ہیں۔

الفتنۃ الکبریٰ

مصر کے (نابینا) جید عالم، مؤرخ، محقق ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا معرکہ آرا کارنامہ جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے ـــ قرن اول کی تاریخ کے نازک ترین مرحلہ کی تصویر۔ اپنے موضوع پر لاجواب کتاب کا شگفتہ ترجمہ ـــ قیمت چھ روپے۔

ملنے کا پتہ: میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور

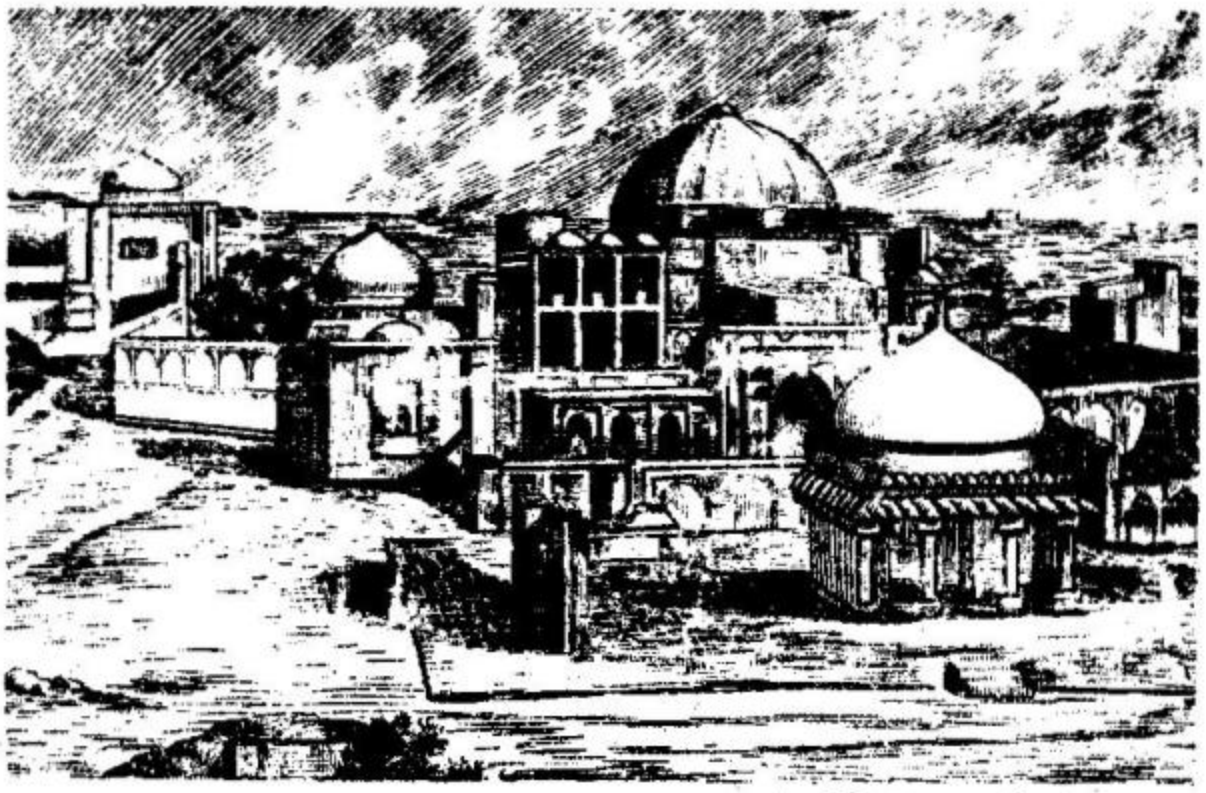

مغربی پاکستان کا تاریخی شہر

ٹھٹھہ

ٹھٹھہ پاکستان کے نہایت قدیم شہروں میں سے ہے۔ اور کئی زبردست مملکتوں کا دارالخلافہ رہ چکا ہے۔ ایک زمانے میں یہ بہت بڑا تعلیمی، ثقافتی اور تجارتی مرکز تھا۔ جہاں دنیا کے مختلف حصوں سے طالب علم اور تاجر آیا کرتے تھے۔ اب یہ ایک چھوٹا سا شہر اور اپنے ضلع کا صدر مقام ہے۔ لیکن اس کے تاریخی آثار، مقبرے اور مسجدیں اب بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔

ٹھٹھہ کے چھوٹے سے شہر میں بھی ڈاک خانے کے سیونگ بنک کا انتظام موجود ہے جس سے یہاں کے باشندے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ڈاک خانے کے [illegible] ہزار ۵ سو سے زائد دفاتر میں بچت کھاتہ کھولنے کا انتظام موجود ہے جو ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

آپ پاکستان میں جہاں کہیں بھی جائیں

ڈاک خانے کا سیونگ بینک

آپ کی خدمت کے لئے موجود ہے

شرح نفع ۲½ فیصدی سے ۳½ فیصدی تک، انکم ٹیکس سے معاف

عائلی قوانین کی اسلامی حیثیت

پاکستان میں عائلی قوانین کا نفاذ، اسلام کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ آنے والا مؤرخ لگا سکے گا جو موجودہ ضد اور تعصب کی فضا سے الگ ہٹ کر، معاملہ کو غیر جانبدارانہ نگاہ سے دیکھے گا۔

عائلی کمیشن ۱۹۵۶ء میں مقرر ہوا تھا۔ اس نے سفارشات کیں۔ ان پر اعتراضات ہوئے۔ پھر سکوت طاری ہو گیا۔ اب (مارچ ۱۹۶۱ء میں) عسکری حکومت نے آرڈی ننس جاری کیا۔ اس پر پھر بحث کا دروازہ کھلا۔ بالآخر (۱۵ر جولائی ۱۹۶۱ء سے) ان قوانین کا نفاذ ہو گیا۔ یہ تدریجی مراحل اتنے لمبے عرصے میں طے ہوئے کہ ان کے ماجریات عام طور پر ذہنوں میں مستحضر نہیں۔ معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر ضرورت تھی کہ ان تمام واقعات کو مسلسل طور پر یکجا اکٹھا کر دیا جائے۔ اس فریضہ کو محترم انصاری صاحب نے سرانجام دیا۔ ان کا یہ مضمون پہلے روزنامہ جنگ (کراچی) میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ لیکن بعض مقامات پر تشنہ تھا۔ انصاری صاحب نے ہماری استدعا پر اس پر نظر ثانی فرمائی اور ضروری ترمیم و تنسیخ اور اضافوں کے ساتھ اسے (گویا) از سر نو مرتب فرما دیا۔ ہم ان کے شکریہ کے ساتھ اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

عائلی قوانین کی اسلامی حیثیت

از محترم احمد محی الدین صاحب انصاری ریٹائرڈ جج ہائیکورٹ، حیدرآباد دکن

عمرانیات کی تاریخ بتلاتی ہے کہ انسان نے جب سے شعور سنبھالا، مدنی زندگی کا آغاز ہوا، اور معاشرہ میں نظم و ضبط کی ضرورت کا احساس ہونے لگا، مرد کو عورت پر ہر جگہ اور ہر زمانہ میں فضیلت حاصل رہی ہے۔ گھر کا آقا، قبیلے کا سردار، اور قوم کا سربراہ کار وہی ہوا کرتا تھا اور عورت نہ صرف اپنی پرورش کے لئے مرد کی محتاج تھی بلکہ اپنی سلامتی اور بقا کے لئے بھی مرد کے زیرِ سایہ اور اُس کی تابع فرمان تھی۔ جس طرح کوئی اتنے ہی جانور پالتا ہے

عورت کی حیثیت

جتنوں کی وہ پرورش و پرداخت کر سکے اسی طرح عورتیں بھی اس کے پاس متعدد ہوتیں اور جانوروں ہی کی طرح مبادلے اور قیمتاً ان کا لین دین بھی ہوتا۔ وجہ ظاہری عورت کی کمزوری تھی اور باوجودیکہ بحرالکاہل کے بعض جزائر بورنیو۔ ملایا۔ برما اور ملابار میں بعض قبیلوں میں کبھی نہ کبھی (Matrearchale) کا نظام رائج رہا ہے جہاں مرد عورت کے محکوم اور تابع فرمان ہوا کرتے تاہم من حیث المجموع ساری دنیا میں عورت مرد کے زیرِ نگیں اور محتاج ہی رہی ہے وہ جسمانی طور پر ضعیف و نازک ہے اور بعض فطری کمزوریاں بھی اسے زندگی کی جدوجہد سے ممنوع اور باز رکھتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ بعض دوسرے نقائص اور کمزوریاں بھی غیر صحیح طور پر اس کی جنس سے وابستہ کر دی گئی ہیں اور یہ سب اتنے زمانہ سے مسلسل چلا آ رہا ہے کہ عورت خود یہ سمجھنے لگ گئی کہ جو نقائص اور کمزوریاں اُس سے منسوب کی جاتی ہیں اور جس کے وجوہ و اسباب سے اسے مرد کے مقابلہ میں ایک کمتر درجہ حاصل ہے واقعی صحیح ہیں اور اسے انگیز کئے بنا کوئی چارہ نہیں۔ تہذیب و تمدن کی تدریجی ترقیاں بھی اس زبوں صورتِ حال کی چنداں اصلاح نہ کر سکیں۔

ادیان و مذاہب نے بھی، جہاں تک ہمیں معلوم ہے، عورت کے ساتھ انصاف کرنے کی کوئی مستحسن کوشش نہیں کی ہے۔ چینی، جاپانی مذاہب تاؤیزم۔ شنتوئیزم۔ اور بدھ مذہب میں جہاں ایک حد تک مرد مورثوں کی پرستش دیوتاؤں کی طرح کی جاتی ہے ذکور کو اناث پر ہر جگہ اور ہر زمانہ میں فوقیت دی جاتی رہی۔ یہی حال ہندو مذہب کا ہے جس میں عورت کو ایک نہایت ذلیل درجہ پر رکھا گیا ہے۔ پیدائش ہی سے لڑکی کی کچھ ایسی تربیت کی جاتی ہے کہ وہ مرد کی خدمت کے لئے پیدا ہوئی ہے اور شوہر کے فوت ہو جانے پر اس کی زندگی ہی بے کار ہے۔ دین موسوی اور مسیحیت میں بھی جیسا کہ ان کی موجودہ کتب مقدسہ سے پتہ چلتا ہے عورت ایک ذلیل مخلوق متصور ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ تیسری صدی عیسوی تک بھی مقتدایان مذہب عیسوی کی مجالس علمی میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ آیا عورت کے روح ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ غنیمت ہے کہ بالآخر تصفیہ عورت کے حق میں ہوا اور نہ وہ جانور سے بھی گئی گذری مخلوق ٹھہرتی۔ تورات جیسی کچھ ہے اور موجودہ مسیحیت کی تو تعلیم یہ ہے کہ جس طرح ہندو مذہب میں عورت برہما کے تلوے سے پیدا ہوئی ہے اسی طرح اماں حوا آدم کی پسلی سے پیدا کی گئیں۔ شیطان کی آلہ کار بنیں اور آدم کے جنت سے نکالے جانے کی ذمہ دار ٹھہریں۔ البتہ

اسلام اور عورت

اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے انسان کو محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم قرار دیا۔ مرد اور عورت کو ایک اور مساوی درجہ دیا۔ پاکبازی و عصمت اور نیک اخلاق اور عمدہ کردار کے عمومی معیار مرد اور عورت دونوں کے لئے یکساں قرار دیئے۔ ایک صنف دوسرے کی تابع فرمان، محتاج و زیر نگین نہیں۔ گو وظائف حیات مختلف تھے علم و تربیت حاصل کرنے کے مواقع دونوں کے لئے یکساں رکھے اور حقوق و ذمہ داریاں مساوی۔ اور عورت کو مرد کی محتاج اور تابعدار نہیں تصور کیا۔ یہاں یہ تحقیق غیر ضروری ہے کہ کب اور کس طرح ہوا لیکن صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے اور وجہ اس کی سوائے اس کے کچھ اور نہ تھی کہ عورت کھانے کپڑے اور اپنی حفاظت و سلامتی کے لئے فطرتاً مرد کی محتاج تھی۔ الغرض یہ ایک حقیقت نفس الامری ہے کہ مسلمانوں میں بھی عورت بتدریج قرآن اور اللہ کے رسول کے دیئے ہوئے حقوق سے محروم ہوتی گئی۔

مسلمان اور عورت

اور جد و جہد حیات اور حصول علم میں اس کی آزادی محدود۔ تعلیم و تربیت بھی اس کی کچھ اس نہج پر کی جانے لگی کہ خواہ وہ کتنی ہی حسین و جمیل اور ذہین و فطین کیوں نہ ہو وہ اپنے آپ کو مرد کے مقابلہ میں کمتر محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہمارے معاشرہ کا یہ حال ہے کہ لڑکے کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ بڑے لاڈ پیار سے اس کی پرورش کی جاتی ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی تعلیم و تربیت ایک خاص معیار و انداز پر کی جاتی ہے اور زندگی میں ترقی اور کامیابی کے سارے مواقع

اس کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس لڑکیوں کے کان میں پیدائش ہی سے یہ بات پھونکی جاتی ہے کہ مرد کے ساتھ وہ مساوات و مسابقت کا خیال بھی نہ کرے۔ اندر ہی اندر اُس میں ایک احساس کمتری راسخ اور پختہ ہوتا چلا جاتا ہے جیسے جیسے وہ سنِ شعور کو پہنچتی ہے کام بھی اس کے ذمے ایسے لگائے جاتے ہیں جو مرد کے شایانِ شان نہیں تصور کئے جاتے۔ باپ بھائی اور اہل خاندان کی خدمت ہی اُس کا فریضہ ہے گویا اس کی پیدائش کی یہی غرض و غایت ہے جس کی باحسن الوجوہ انجام دہی کے لئے اُسے تیار ہونا چاہیئے۔ اس کا وظیفۂ حیات افزائشِ نسل۔ بچوں کی پرورش و پرداخت، گھر کا انتظام اور شوہر کی خدمت کرنا ہے۔ وہ ہمیشہ سے یہی سنتی چلی آرہی ہے کہ کارزارِ حیات میں، مردوں کا مقابلہ کرنے کی اس میں ہمت نہیں خواہ اسے کتنا ہی تعلیم و تربیت سے سنوارا جائے وہ کسی میدان میں مرد کی برابری نہیں کر سکتی اور یہ واقعہ ہے کہ سبب خواہ کچھ ہی ہو اب تک علوم و فنون، ادب، فلسفہ، مذہب و سیاست میں اس نے مردوں کے مقابلہ میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ علم و تعلیم سے صدیوں اسے محروم رکھا گیا۔ ورنہ جیسا کہ دونوں محاربات عظمیٰ میں ہمارا تجربہ ہے عورت کو جب بھی اور جہاں بھی موقع ملا ہے وہ مرد سے پیچھے نہیں رہی۔ اور اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خلقت کے اعتبار سے، وہ کمزور اور ناقص العقل ہے۔ الغرض عورت جو اب تک اس پس پا افتادہ حالت میں رہی ہے اس کا سبب یہ نہیں کہ اس میں قابلیت و صلاحیت کا فقدان ہے۔ اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ کی تنظیم ہی کچھ ایسی نہج پر واقع ہوئی ہے کہ عورت کو ترقی اور حصول کمال کا موقع ہی میسر نہیں آیا۔ مغرب میں عورت نے اول تو معاشی آزادی حاصل کی اور زیورِ تعلیم سے آراستہ رہی اور مرد کی محکومی اور غلامی کا جُوا کندھے سے اتار پھینکا۔ اور اب کم و بیش ہر میدان میں مرد کے مدمقابل ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مغرب کی عورت نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال نہیں کیا نتیجہ اس کا یہ ہے کہ عائلی زندگی سے امن خوش حالی اور ہم آہنگیِ زن و شوہر رخصت ہو گئی۔ اور سوسائٹی کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا۔ اس کو دیکھ کر اہلِ مشرق اور چوکنے ہو گئے ہیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے وہ اس فکر میں منہمک ہیں کہ مشرق کو کس طرح اس خطرہ سے دور رکھا جائے جس سے مغرب دوچار ہے۔

مغربی عورت

گذشتہ پچاس سال سے تعلیم نسواں پر کافی زور دیا گیا ہے۔ پردے کی کڑی سختیاں بھی نرم کر دی گئی ہیں۔ زیورِ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہو کر مسلمان عورتوں نے بھی سوشل خدمات اور دوسرے میدانوں میں کارہائے نمایاں کئے ہیں لیکن جس طرح سب مرد معصوم، پاکباز اور اعلیٰ اخلاق و کردار کے حامل نہیں ہوتے عورتوں میں بھی بعض نے یورپ کی دیکھا دیکھی بے راہروی کی چال اختیار کی جس سے اچھے نتائج کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی کا ردِ عمل ہے جو آئے دن عورت کی تعلیم اور آزادی و حقوق کی اتنی مخالفت کی جانے لگی ہے۔ لیکن یہ صحیح

تعلیم اور ٹھیک تربیت سے یہ رجحان دور کیا جاسکتا ہے اور معاشرہ کو ان خراب نتائج سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے جو آزادی کے بیجا استعمال کا نتیجہ ہیں لیکن بڑے افسوس کا مقام ہے کہ سوئے تدبیر کہیئے یا انصاف کے احساس کا فقدان ہم سرے سے یہ ماننے کے لئے ہی تیار نہیں ہوتے کہ زمانہ گذشتہ میں عورتوں کے حقوق سلب کئے گئے ہیں اور اب بھی انہیں ناانصافیوں اور مایوسیوں میں مبتلا کیا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت اس غیر معقول طریق عمل کے خلاف بغاوت پر اُتر آئی ہے اور شدت سے کوشاں ہے کہ جو حقوق و مراعات اس کو اللہ اور اس کے رسول نے دیئے ہیں اور جن کے متعلق وہ سمجھتی ہے کہ مردوں نے اپنی معاشی برتری کے برتے پر غصب کر رکھا ہے دوبارہ حاصل کرے۔

عورت کی طرف سے ردِ عمل

یورپ کی عورت کی آزادی اور افراط و تفریط کے خراب نتائج کے مدنظر حفظ ماتقدم کی تدابیر اپنی جگہ پر صحیح ہیں لیکن اب جبکہ عورت علم و تعلیم سے آراستہ ہو کر اپنا مقدمہ دلیل و برہان کے ساتھ پیش کرنے کے قابل ہو گئی ہے اور اس نے اپنے حقوق کے صحیح استعمال کی صلاحیت بھی پیدا کر لی ہے انصاف پسند طبیعتیں ان دلائل و براہین کو نظر انداز نہیں کرسکتیں۔ مردوں کو بھی فی الجملہ اپنا زاویہ نظر بدل دینا چاہیئے۔

مرد اپنے تفوق و برتری کا اب تک ناجائز استعمال کرتے رہے اور جاہل عورت جو اپنے حقوق سے واقف نہ تھی برداشت کرتی رہی۔ پاکستان کے قیام کے بعد عورتوں کو توقع تھی کہ اسلامی سلطنت قایم ہو گئی ہے انہیں بھی اپنی حالت کو بہتر بنانے اور قوم کی ترقی میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے گا لیکن بعض بوالہوس اور بداندیش ارباب اقتدار سے کچھ ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں کہ عورتوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک زبردست ہل چل مچ گئی اور سوشل ریفارم کے لئے جد و جہد شروع ہوئی۔ طبقہ نسواں کے شدید احتجاج کی بنا پر پاکستان کی گورنمنٹ نے بھی یہ مناسب جانا کہ ان کی جائز شکایات کی تحقیقات ہونی چاہیئے۔ اور ملکی قانون کے ذریعہ ان نامناسب غیر منصفانہ روایات اور طور و طریق معاشرہ اور مروجہ اطوار و رسوم جن کو بظاہر مذہب کی بھی حمایت حاصل ہے لیکن جن کی قرآن مجید اور شریعت حقہ سے تائید نہیں ہوتی اصلاح ہونی چاہیئے۔ یہ شکایات زیادہ تر نکاح، طلاق، وراثت، حق نان و نفقہ اور نزاعات عائلی کے تصفیوں میں عدالتوں کی تاخیر سے متعلق تھیں۔

عائلی کمیشن کا تقرر

چنانچہ خلیفہ شجاع الدین صاحب کی صدارت میں ایک عائلی کمیشن مقرر کیا گیا جس نے ایک سوالنامہ مرتب کر کے علمائے کرام اور ارباب فکر اور خواتین کے نمایندوں کے پاس بھیجا۔ ملک کے اصحاب غور و فکر سے ان سوالات کے بارے میں رائے طلب کی گئی۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب اس کمیشن کے معتمد تھے۔ بقیہ اراکین میں تین خواتین بھی شامل تھیں۔ خلیفہ شجاع الدین صاحب دوران تحقیقات کمیشن میں رحلت

فرما گئے اور سابق چیف جسٹس میاں عبدالرشید صاحب ان کی جگہ صدر مقرر کئے گئے۔ کمیشن میں علماء کی نمایندگی مولانا احتشام الحق صاحب نے فرمائی۔ بعد تکمیل دریافت کمیشن مولانا کے موصوف نے رپورٹ متفقہ سے اختلاف فرمایا اور ایک اختلافی نوٹ تحریر کیا۔ جس کا صرف ایک خلاصہ میری نظر سے گزرا ہے۔ بقیہ ارکان کی متفقہ رپورٹ اور چند تجاویز گورنمنٹ کے ملاحظہ میں پیش ہوئے۔ لیکن اس کے بعد گورنمنٹ نے کوئی احکام صادر نہیں فرمائے کیونکہ حکومتیں خود اس کے بعد ہمیشہ معرض خطر میں رہیں۔ یہاں تک کہ انقلاب آیا اور مارشل لار کی گورنمنٹ قائم ہوئی اور وہ دستور ہی باقی نہ رہا جس کے تحت اس کمیشن کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ لیکن اس اثنا میں اس رپورٹ پر کافی تنقید اور لے دے ہوئی۔ خاص کر طبقۂ علمائے کرام کی جانب سے بڑی کڑی تنقیدیں شائع ہوئیں۔ ادھر رپورٹ اور اس کی تجاویز کی تائید میں بھی اخبارات و رسائل میں بہت سے مضمون چھپے۔ لیکن کچھ دنوں بعد یہ غبار آلود مطلع صاف ہو گیا اور انقلاب حکومت کے بعد لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ قصہ ہی ختم ہو گیا یہاں تک کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب نے

آرڈیننس

صدر مملکت منتخب ہو جانے کے بعد اپنے خاص اختیارات کے تحت اس رپورٹ کے متعلق موافق و مخالف آرار کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ۲ مارچ ۱۹۶۱ء کو ایک آرڈیننس کا نفاذ فرمایا جس میں متذکرہ صدر عائلی کمیشن کی چند سفارشات کو تھوڑی ترمیم کے ساتھ قانونی شکل دیدی گئی اور اس قانون کے نفاذ کی تاریخ کا تعین بر آیندہ رکھا گیا۔

اس پر پھر تائید و تنقید کا سلسلہ شروع ہوا۔ مخالفت میں جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ مارشل لا کے نفاذ کے قبل ہی لکھا جا چکا اب پریس میں چنداں مخالفت ظاہر نہیں ہوئی۔ لیکن اکثر صحبتوں اور مجلسوں میں موضوع سخن یہی ہے بعد نفاذ آرڈیننس چودہ علمائے کرام کی دستخط سے ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں نئے قانون کے اہم دفعات پر سخت نکتہ چینی کی گئی ہے۔ اعتراضات زیادہ تر وہی ہیں جو اخبارات و رسائل میں ظاہر کئے جا چکے ہیں۔ اور بعض نئے اعتراضات اور دلائل بھی پہلی بار سامنے آئے ہیں جس پر کافی رد و قدح ہوتی رہتی ہے۔ میں نے جہاں تک غور کیا لوگوں میں اس کا عام احساس پایا جاتا ہے کہ مسائل زیر بحث کے موافق و مخالف پہلو ایک ساتھ سامنے نہیں آئے ہیں۔ اور افراط و تفریط سے بچتے ہوئے ایک معقول اور منصفانہ موازنہ عوام کے ملاحظہ میں نہیں آیا تاکہ ٹھنڈے دل سے جانبین کی آرار پر غور کیا جائے اور بعض تجاویز کمیشن کے بارے میں جس کو موجودہ گورنمنٹ نے ترمیماً منظور فرمایا ہے اور خود قانون کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کی جا سکے۔ اسی کے مدنظر میں نے کوشش کی ہے کہ مسائل زیر بحث پر اب تک مخالف و موافق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے اور بتلایا جائے کہ موافقین نے کہاں حد سے تجاوز کیا اور مخالفین کہاں غیر معقول رویہ پر چلے گئے ہیں۔ اس سے

عوام کو یہ غور کرنے میں سہولت ہو گی کہ اس وقت صحیح پوزیشن کیا ہے آیا قانون نافذہ حال میں کسی ترمیم کی ضرورت ہے جس پر مناسب ذرائع سے گورنمنٹ کو متوجہ کیا جا سکے۔

مخالفین کا نقطہ نظر جہاں تک مسلک قدیم کے طبقہ علماء کا تعلق ہے ان کی کوئی ایسی تحریر میری نظر سے نہیں گذری جس میں انہوں نے یہ تسلیم کیا ہو کہ احکام شریعت اور ان کی تعبیر و اطلاق میں عورتوں کے ساتھ کوئی سختی یا ناانصافی ہوئی ہے لیکن ان کے قابل وکیل (Manige Law Commission Report X Rayed) کے فاضل مدیر مولوی خورشید احمد صاحب نے اپنی کتاب کے پیش لفظ اور تعارفی نوٹ میں صاف صاف اور کھلے لفظوں میں اعتراف فرمایا ہے کہ ہمارے معاشرتی حالات کسی طرح ایسے نہیں جو ہونے چاہئیں۔ مسلم معاشرہ فی زمانہ ورطۂ تنزل میں مبتلا ہے اور اس میں انتشار اور خرابیوں نے جڑ پکڑ لی ہے۔ عورتوں کی حالت نہایت ابتر ہے اور قابل رحم اور اسلام کے دیئے ہوئے حقوق سے محروم کر کے اس کی حالت کو اور تباہ کیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے ذہن ہی سے یہ بات نکل گئی ہے کہ اسلام کیا ہے اور ان سے کن باتوں کا تقاضا ہے اور مرد و عورت دونوں میں اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس ہی نہیں رہا۔ سب سے بڑا سبب اس زبوں حالت کا ان کی دانست میں یہی ہے کہ عورتوں کو عرصہ دراز سے علم سے محروم کر کے جہل میں مبتلا کیا گیا جس سے ان خرابیوں میں اور زیادتی ہو گئی ہے۔ معاشرتی خرابیوں کے علل و اسباب کا ذکر کرتے ہوئے وہ سوشیل ریفارم کی ضرورت سے تو اختلاف نہیں کرتے مگر جو تجاویز اصلاح پیش فرماتے ہیں وہ تعلیم عوام اور پروپاگنڈا سے آگے بڑھتے نہیں پاتیں۔ ان کو شکایت ہے کہ نام نہاد مصلحین اور وہ اصحاب جن کے ہاتھوں میں زمام حکومت و اقتدار آ گئی ہے مغرب زدہ ہیں اور احساس کمتری میں مبتلا۔ وہ کمال اتاترک کے قدم بقدم چلنا چاہتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے ملک اور ترکی کے حالات میں کس قدر فرق ہے اور وہ تدابیر جو ترکی میں اختیار کی گئی ہیں ہمارے ہاں کس حد تک ناقابل عمل ہیں۔ اتاترک میں اتنی اخلاقی جرأت تو تھی کہ اس نے اسلام اور شرع و شعار اسلامی کو مانع ترقی قرار دے کر ریفارم کی بنیاد سیکولرازم پر رکھ دی۔ لیکن کس قدر بدقسمتی ہے کہ ہمارے ملک کے مصلحین اور ارباب اقتدار یہ ہمت تو نہیں رکھتے کہ علانیہ اتاترک کی طرح اسکیم اصلاحات سے کھلم کھلا اسلام کو خارج کر دیں اور سیکولرازم پر اصلاحات کی بنا ڈالیں۔ یوں تو یہ بھی وہی کچھ کر رہے ہیں جو اتاترک نے کیا لیکن یہ کر رہے ہیں اسلام کے نام پر جو سراسر اسلام پر ظلم ہے۔ کیونکہ ہماری منزل مقصود دائرۂ اسلام میں رہ کر ترقی کرنا ہے اور محض مغربی کلچر کی نقالی نہیں۔ ان کو یہ بھی شکایت ہے کہ ہمارے نام نہاد مصلحین اور ارباب اقتدار مغرب کی ہر بات کو جو ان کے پسند خاطر ہے اور مغرب میں مقبول اور تہذیب و شائستگی کی

علامت سمجھی جاتی ہے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ عین اسلامی ہے۔ اس سے مقصود ان کا نہ صرف مغربی کلچر کی اشاعت ہے بلکہ اس احساس کمتری کو بھی چھپانا ہے کہ اسلام مانع ترقی ہے۔

یہ کتاب نئے قانون کے نفاذ کے قبل شائع ہوئی ہے اور اس کی تنقید زیادہ تر عائلی کمیشن کی رپورٹ اور تجاویز سے متعلق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر فرد کو ہمارے ملک میں کسی بھی مسئلہ پر آزادانہ رائے قایم کرنے اور اسے آزادی سے ظاہر کرنے کا بنیادی حق حاصل ہے لیکن خواہ مخواہ دوسرے کی نیت پر حملہ کرنا اور مخالف رائے رکھنے والے کو

دشنام طرازی

کڑوی زبان اور زشت الفاظ میں مخاطب و منسوب کرنا کسی کو زیب نہیں دیتا۔ افسوس ہے کہ اس کی نمایاں جھلکیاں ان کی کتاب میں نظر آتی ہیں جن سے اجتناب ہی مناسب تھا کیونکہ مخالف کو دشنام دینے سے نہ تو اس کی حجت و دلیل کی تخفیف ہوتی ہے اور نہ اپنی دلیل کو تقویت میں کوشش کروں گا کہ اس سے اپنے قلم کو آلودہ نہ ہونے دوں۔

گذشتہ چار یا پانچ سال کے عرصہ میں اس مضمون پر پریس میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھنے والوں میں علمائے کرام۔ ارباب فکر و نظر۔ اہل الرائے سب ہی شامل ہیں جنھیں دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا

دو گروہ

ہے۔ علمائے کرام کا ایک وہ گروہ ہے جس کی نمایندگی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ مولانا احتشام الحق صاحب۔ اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی فرماتے ہیں۔ اور دوسرا وہ گروہ ہے جس میں چند سوشل ریفارم کے حامی اصحاب الرائے اور اعلیٰ عدالتوں کے جج اور جناب پرویز صاحب ہیں۔ اول الذکر گروہ اس عقیدہ کا حامل ہے کہ قرآن مجید کے اصولی احکام کی تعبیر و تفسیر اور فروعی احکام پر ان کا اطلاق اور ان کی تدوین جو مقتدایان مذاہب فقہ اور علمائے متقدمین نے حدیث و روایات سنت نبویؐ کی بنا پر کر دی ہے اسے بے چون و چرا قبول کرنا چاہیئے وہی صحیح ہے اور اس میں دست اندازی معصیت و ضلالت ہے۔ انہوں نے جو طے کر دیا ہے اور جس پر چودہ سو سال سے عمل ہوتا آرہا ہے اس کی تقلید لازمی ہے گویا اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ دوسرے گروہ کی نمایندگی میرے خیال میں جناب پرویز صاحب فرماتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قرآن مجید کے احکام نہایت صاف صریح اور واضح ہیں اور یہی خود اس کا دعویٰ بھی ہے۔ ہر شخص انہیں سمجھ سکتا ہے اس لئے تعبیر و تفسیر میں قدما کی تقلید لازمی نہیں۔ حدیث و روایات سنت کا جہاں تک تعلق ہے اُن سے اسی صورت میں استفادہ کیا جا سکتا ہے جبکہ وہ قرآنی اسپرٹ سے ہم آہنگ ہوں اور اس کے مغایر نہ ہوں۔ اور جو ایسی ہوں وہ نہ تو صحیح حدیث ہو سکتی ہیں اور نہ صحیح روایات سنت۔ غرض جس قدر بھی مذاہب فقہ رائج ہیں چونکہ ان کے متعلق یہ باور کیا جاتا ہے کہ وہ صحیح حدیث اور صحیح

روایاتِ سنت پر مبنی ہیں اس لئے جو اصحاب ان مذاہب فقہ کی ہر معاملہ میں من و عن تقلید لازمی نہیں سمجھتے وہ منکرِ حدیث ٹھیرائے جانے لگے۔ ترجمان القرآن ۔ طلوعِ اسلام ۔ ثقافت ۔ فاران، وغیرہ اکثر رسائل و اخبارات میں کئی مضامین مخالف و موافق شائع ہوتے رہے ہیں جس پر فرداً فرداً تبصرہ میں نے غیر ضروری سمجھا۔ البتہ مسٹر خورشید احمد ایم۔ اے۔ ایل ایل بی کی کتاب (Maniage Law Commition Report X Rayed) میں جمع کئے ہوئے مواد سے کافی مدد لی ہے اور ان کے دلائل و استدلال سے استفادہ بھی کیا ہے۔ بعد نفاذ قانون اخبار ڈان میں مسٹر کے ابن احمد صاحب نے ایک سلسلۂ مضامین کا شائع فرمایا۔ اس سے بھی میں نے مدد لی ہے۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم یوسف صاحب۔ صدر شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی کا مضمون مندرجہ مارننگ نیوز مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۶۱ء بھی میرے پیشِ نظر رہا ہے جس پر مسئلہ تعدد ازدواج کے سلسلہ میں غور کیا جائے گا۔ چودہ علمائے کرام کا پمفلٹ بھی میرے سامنے ہے۔ یہ خاص توجہ کا مستحق ہے۔ گورنمنٹ کے نافذ کئے ہوئے آرڈیننس میں جو احکام مدون ہوئے ہیں اسی سلسلہ سے سوالنامہ کمیشن اور جوابات رپورٹ کمیشن اور پھر اس پر تنقید، پھر قانون جدید اور اس کے احکام پر تبصرہ کرنا مناسب ہوگا۔

وراثت بہ لحاظ قانون جدید پہلا حکم یتیم پوتا پوتی نواسہ نواسی کی وراثت سے متعلق ہے۔ کمیشن کا اس بارے میں سوال یہ تھا کہ آیا کسی نص صریح یا حدیث صحیحہ کی رُو سے یتیم پوتے، پوتی نواسہ نواسی محروم الارث قرار پاتے ہیں؟

مولانا مودودی صاحب نے اس کا صاف جواب نہیں دیا۔ جس سے مترشح ہے کہ کوئی نص صریح یا حدیث صحیحہ اس عمل کی تائید میں نہیں ہے۔ ان کے اس ارشاد کا کہ اصولی احکام قرآن شریعت و حدیث سے خود بخود اس کی تائید میں نتیجہ نکلتا ہے۔ مطلب ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ جب کوئی صاف و صریح احکام نہیں ہیں اور نہ کوئی حدیث صحیحہ اس کی تائید میں موجود ہے تو خود بخود اس کی تائید میں نتیجہ کیسے نکل سکتا ہے؟ انہوں نے اپنے جواب میں یہ اندیشہ ظاہر فرمایا کہ اگر موجودہ طریق وراثت میں کوئی تبدیلی ہو تو سارا نظام وراثت درہم برہم ہو جائے گا۔ جواب سے یہ واضح نہیں کہ یہ آفت کیوں اور کس طرح برپا ہو گی۔ البتہ کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے تجاویز کمیشن کی جو تنقید فرمائی ہے اس میں یہ تو اعتراف کیا گیا ہے کہ کمشنروں کی ہمدردی یتامیٰ کے ساتھ قابل قدر ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے کہ ان کی فلاح و بہتری کے لئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔ لیکن جہاں تک وراثت کا تعلق ہے انہوں نے بھی مولانا مودودی صاحب ہی کی رائے سے کلیتاً اتفاق فرمایا کہ کوئی تبدیلی عمل میں لائی گئی تو سارا نظام وراثت شرعی درہم برہم ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے بھی یہ بتلانے کی

ضرورت نہیں سمجھی کہ یہ دردناک سانحہ کیوں اور کس طرح ظہور پذیر ہوگا تاکہ گورنمنٹ ضروری تدابیر حفظ ماتقدم پر بھی غور کر سکتی۔ مولانائے موصوف نے 'جماعت اسلامی کے ایک پمفلٹ پر اپنے استدلال کی تفاصیل کو محول فرما دیا۔ جس سے میں مستفید نہ ہو سکا۔ لیکن ترجمان القرآن ۱۹۵۶ء میں اس بارے میں ایک سوال اور اس کا جواب منجانب مودودی صاحب شایع ہوا ہے۔ اس میں وہ اعتراف فرماتے ہیں کہ انہیں قرآن مجید کی کوئی نص صریح یا حدیث کا کوئی صریح حکم نہیں ملا جو فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دی جاسکے کہ یتیم پوتا پوتی نواسا نواسی، کو وراثت میں حصہ نہ ملے گا۔ ان کی حجت یہ ہے کہ علمائے سلف اور فقہا کی متفقہ رائے سے اختلاف کرنا مشکل ہے۔ جماعت اسلامی کی جانب سے ایک پمفلٹ اور ادارہ طلوع اسلام کی جانب سے ایک پمفلٹ شایع ہوا تھا۔ ان دونوں میں جو مباحث علمی اور فنی فرابعض کے ہیں ان سے عوام کو دلچسپی نہیں۔ مگر یہ حقیقت قابل ذکر ہے کہ جس طرح مولانا مودودی صاحب کا خیال ہے حجب وحرماں یتامیٰ کا مسئلہ علما و فقہائے سلف کا متفق نہیں ہے ہر دو جانبین کے بیانات و استدلال پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یتامیٰ کے ساتھ ناانصافی ہوتی رہی ہے دادا یا نانا کے ترکہ سے انہیں محروم کرنے کی تائید میں بغیر اس کے کوئی استدلال نہیں کہ قدیم سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے اور علما و فقہائے سلف کی رائے سے اختلاف کرنے کے کوئی وجوہ نہیں ہیں۔

دوسرا مکتب فکر

دوسرے مکتب فکر والوں نے جواب دیا تھا کہ نص صریح تو کجا کوئی اشارہ ہی نہیں اور یتامیٰ کے حقوق کے تحفظ کی خاطر جس کا قرآن کو خاص خیال ہے ایسی کھری نص قرآنی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ تفصیل کے لئے انہوں نے ادارہ طلوع اسلام کے شایع کردہ پمفلٹ موسومہ "یتیم پوتے کی وراثت،" کا حوالہ دیا۔ اس پمفلٹ کا میں نے مطالعہ کیا یہ ایک تو علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم کے مقالہ " محجوب الارث " پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ جس میں مرحوم نے فنی نقطۂ نظر سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ جو لوگ موجودہ طریق تقسیم ترکہ اور حجب وحرماں یتامیٰ کی تائید میں ہیں سوائے اس کے اور کوئی استدلال نہیں رکھتے کہ قدیم سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے اور اسے جوں کا توں رکھنا چاہیئے۔ حالانکہ معقول دلائل اس کی تردید کے لئے موجود ہیں قطع نظر اس کے مسئلہ کا یہ پہلو خود علماء کے ہاں متفق علیہ نہیں ہے پس ایسی صورت میں کمیشن نے اس حقیقت کے مد نظر کہ یتیم پوتے اور نواسے کو ارث سے محروم کرنے میں سختی ہوئی ہے اور حجب وحرمان کی تائید میں کوئی نص صریح یا حدیث صحیح نہیں ہے یہ سفارش پیش کی کہ اس طریق تقسیم ارث کو ختم کر دینا چاہیئے اور یتیم پوتے اور نواسے کو مستحق ترکہ قرار دینا چاہیئے۔ واضح ہو کہ مولانا احتشام الحق صاحب رکن کمیشن نے اس تجویز سے اختلاف فرمایا تھا۔ اس اختلافی نوٹ کا صرف ایک خلاصہ میری نظر سے

گذرا ہے اس لئے میں اس کے تفصیلی استدلال سے ناواقف ہوں لیکن غالباً ان کی رائے بھی اسی حجت پر مبنی ہے کہ یہ مسئلہ علما و فقہائے سلف نے بالاتفاق طے فرمایا ہے اس میں دست اندازی نہ ہونی چاہیئے۔ میری ناچیز رائے میں

نیا قانون صحیح ہے

کمیشن اور آرڈی ننس کی اختیار کردہ پوزیشن بالکل صحیح ہے۔ جب وحرمان کے موجودہ طریق تقسیم سے یتامیٰ کے حق میں سختی اور ناانصافی ہوتی ہے اسے علمائے کرام بھی مانتے ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ اس میں دست اندازی کی جائے تو اصول وراثت ٹوٹ جائے گا۔ اس حجت میں یہ نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ یتیم پوتا اپنے متوفی باپ کے وارث کی حیثیت سے ترکہ نہیں چاہتا بلکہ وہ خود بخود باپ کا قائم مقام ہو جاتا ہے اور غیر اقرب کو ترجیح دیئے جانے کا کوئی محل پیدا نہیں ہوتا۔ طبقہ علمائے کرام کی جانب سے جو دیرینہ پیروی و تقلید کی راہ سے ہٹنا ہی نہیں چاہتے جو مداوا اس سختی اور ناانصافی کا پیش کیا جاتا ہے وہ قابلِ عمل نہیں کیونکہ وصیت کا ہر شخص کو پورا اختیار ہے۔ معاشرہ ہو یا گورنمنٹ زیادہ سے زیادہ کسی کو مشورہ ہی دے سکتی ہے اور یتامیٰ کے لئے وصیت کے ذریعہ کوئی اور مناسب بندوبست کرنے کے لئے وصیت کرنے والے کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

چودہ[1] علماء کا اعتراض

بعد نفاذ قانون جدید چودہ[1] علمائے کرام کی جانب سے ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے اس میں مسئلہ زیر بحث کے تعلق سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ نئے قانون سے یہ لازم آتا ہے کہ ترکہ کی تقسیم کے وقت یتیم کے ماں یا باپ کو زندہ تصور کیا جائے اور پھر بعد تقسیم مردہ قرار دے کر یتیم کو اس کا حصہ دیدیا جائے جس میں کوئی معقولیت نہیں۔ دوسرے یہ کہ بیٹے اور بیٹی کے ساتھ تو یہ رعایت کی جاتی ہے لیکن کسی اور رشتہ دار کے ساتھ یہ سلوک مرعی نہیں رکھا جاتا۔ اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ جو بیٹے باپ کی زندگی میں لاولد فوت ہو چکے ہوں اُن کو بھی زندہ تصور کر کے ان کے حصے کیوں نہیں نکالے جاتے۔ چوتھے یہ کہ متوفی بیٹے یا بیٹی کی اولاد ہی کو کیوں حصہ دلایا جاتا ہے اس کی ماں بیوی اور دوسرے رشتہ دار اس سے محروم کئے جاتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں یہ تمام اعتراضات اس غلط فہمی پر مبنی ہیں کہ تقسیم ترکہ کے وقت کسی کو زندہ یا مردہ فرض کر لیا جاتا ہے۔ دراصل اصول قائم مقامی پر عمل کیا جاتا ہے۔ لڑکا جب تک زندہ تھا پوتا محجوب تھا۔ اس درمیانی کڑی یا حجاب کے رفع ہو جانے کے بعد یتیم پوتا اولاد کی حیثیت سے باپ کی جگہ لے لیتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ معترضین جو یہ اعتراض وارد کرتے ہیں کہ یتیم پوتے کو حصہ دلانے میں مردہ شخص کو زندہ کرنا لازم آتا ہے خود اسی مفروضہ میں مبتلا ہیں۔ درمیانی کڑی جو پوتے کی محرومی کا باعث تھی وہ ٹوٹ چکی

[1] موجودہ قانون شریعت کی رو سے صرف ۱۴ ہیں۔ وہ بھی وارثوں کے لئے نہیں۔ (طلوع اسلام)

جب وحرماں ختم ہو چکا۔ مگر یہ اسے بدستور قایم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے اعتراض میں خود علمائے سلف کا قایم کیا ہوا اصول جس پر ان کو استدلال ہے یعنی الاقرب فالاقرب اُن کی حجت سے متصادم ہے ماسوا اس کے درمیانی کڑی کے رفع ہو جانے پر پوتا بہ حیثیت اولاد اپنے حق کی بنا پر حصہ پاتا ہے۔ باپ کے وارث کی حیثیت سے نہیں۔ اس لئے دوسرے رشتہ داروں کا جو حقدار بعید ہیں لحاظ کرنے یا دوسرے لاولد لڑکے یا لڑکی کو زندہ تصور کرنے کا کوئی محل نہیں۔ اس طرح تیسرا اور چوتھا اعتراض خود ان ہی کے مستدلہ اصول کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر لاولد لڑکے یا لڑکی کو بقول ان کے زندہ ہی تصور کر لیا جاتا تو بھی ان کے ورثا اقرب نہ ہونے کی وجہ سے مستفید نہ ہو سکتے۔ رہا یہ مطالبہ کہ اس نئے قانون کی تائید میں نص صریح یا مستند حدیث کیوں نہیں پیش کی جاتی ایسے اصحاب علم و دانش کی جانب سے زیبا نہیں جو خود معترف ہیں کہ یتیم پوتے کو محروم کرنے کی تائید میں کوئی نص صریح یا مستند حدیث موجود نہیں ہے۔

نکاح نکاح کے سلسلہ میں سوالات نمبر ۲ و ۹ ایک ہی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں مولانا مودودی صاحب کو اعتراض یہ ہے کہ شرعاً کوئی بھی نکاح پڑھا سکتا ہے یہاں تک کہ خود لڑکا اور لڑکی دو گواہوں کے روبرو معاہدہ نکاح کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ سرکاری نکاح خواں کے لزوم سے دوگونہ خرابی ہے۔ اول یہ کہ جنہوں نے سرکاری نکاح خواں سے کام نہ لیا ہو ان کے نکاح ناجائز قرار پا جائیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر لزوم کی ضرورت ہی کہاں رہی۔

جناب پرویز صاحب نے بھی سرکاری نکاح خواں کا لزوم غیر ضروری تصور فرمایا۔

شادیوں کے درج رجسٹر کرانے میں مولانا کی رائے تھی کہ یہ تدبیر مفید اور کار آمد ہے۔ نکاح نامہ ایک مقررہ نمونہ پر مرتب اور شایع کیا جائے جو بآسانی دستیاب ہو سکے جس میں ضروری اندراجات بوقت انعقاد نکاح کرائے جا سکتے ہیں اور شرایط نکاح کی ایک اچھی دستاویزی شہادت مہیا ہو سکتی ہے اسی طرح مناسب حلقوں میں حکومت کی طرف سے رجسٹر رکھا جائے جس میں نکاح اور شرایط معاہدہ کا اندراج کرایا جا سکتا ہے۔ اس سے جو فوائد مترتب ہوتے ہیں ان کے مدنظر عوام خود اس پر عمل پیرا ہوں گے۔ اس کو لازمی قرار دینے میں بعض قباحتیں ہیں اس لئے رجسٹری اختیاری رہے لازمی نہ کی جائے۔ ایک خرابی تو یہ ہے کہ جنہوں نے اس پر عمل نہ کیا وہ قابل مواخذہ قرار پائیں گے اور جرایم کی فہرست میں ایک اور جرم کا اضافہ ہو جائے گا۔ دوسری اور زیادہ خرابی یہ ہے کہ جن نکاحوں کو رجسٹر نہ کرایا گیا ہو عدالتیں ان کو تسلیم نہ کریں گی حالانکہ شرعاً وہ جائز ہیں اور اولاد جو ان نکاحوں سے پیدا ہو ناجائز قرار پا جائے گی۔

جہاں تک کہ نکاح نامہ کا تعلق ہے مولانا مودودی صاحب نے اس کو مفید تصور کیا اور تجویز پیش کی

کہ ماہرین فن اس غرض کے لئے مل بیٹھیں اور ایک نمونہ تیار کریں۔

وہ حضرات جو دوسرے مکتب خیال کی نمائندگی فرماتے ہیں مولانا مودودی صاحب سے اس حد تک متفق معلوم ہوتے ہیں کہ کسی خاص نکاح خواں کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک رجسٹری کا تعلق ہے انہوں نے اس کے لزوم پر زور دیا اور مرد کو اس کا پابند کرنا چاہا ہے کہ اگر وہ معاہدہ کو درج رجسٹر نہ کرلے تو قابل مواخذہ قرار دیا جائے اس سے بہت سی پیچیدگیاں رفع ہوجائیں گی۔ نکاح نامہ کا ایک معیاری نمونہ مرتب کرلئے جانے کی ضرورت پر بھی انہوں نے زور دیا اور اس حد تک مولانا مودودی صاحب کے ہمنوا ہی ہیں۔

عائلی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی تھی کہ سرکاری نکاح خواں کے تقرر میں عملی دشواریاں ہیں لیکن نکاح نامے کا فارم مرتب ہونا ضروری ہے اور نکاح کے معاہدے کی رجسٹری لازمی قرار دینی چاہیئے۔ یہ فرض نکاح خواں کا ہوگا کہ وہ نکاح نامہ بعد ترتیب بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ تحصیلدار کے پاس بھیج دے ورنہ پانچ سو روپیہ جرمانہ کا مستوجب ہوگا۔

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے مسئلہ کے شرعی پہلو پر بڑی تفصیل کے ساتھ غور کیا ہے مجھے اس بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس سے تو کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ نکاح نامہ ایک خاص نمونہ کا مرتب ہو اور اس کی رجسٹری ہوجائے تو کوئی قباحت نہیں بلکہ فائدہ کا موجب ہے۔ البتہ رپورٹ کی تجاویز پر تبصرہ کرتے وقت انہوں نے جن اندیشوں کا اظہار فرمایا تھا آرڈیننس میں ان کے بارے میں کافی تحفظ کردیا گیا ہے۔ انہوں نے رجسٹری کے لازمی کئے جانے سے اختلاف فرماتے ہوئے یہ حجت پیش کی کہ جو بات صریح طور پر قرآن وسنت سے ممنوع نہ ہو جائز ہے۔

نیا قانون

آرڈیننس میں گورنمنٹ نے مقررہ نمونہ کا نکاح نامہ اور یونین کونسل (Basic Democracy) میں رجسٹر رکھے جانے کا حکم صادر فرمایا۔ اور یونین کونسل کو اختیار دیا گیا کہ وہ مناسب حلقوں میں نکاح کے رجسٹراروں کو حکم نامہ عطا کرے جو نکاح خوانی کے علاوہ رجسٹری کا کام بھی کریں گے۔ اسی طرح سرکاری نکاح خواں کے تقرر کے سلسلہ میں جن مشکلات کا کمیشن نے ذکر کیا تھا ان کو رفع کردیا گیا ہے اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے بھی جن اندیشوں کا ذکر کیا تھا ان کا سدباب کردیا گیا ہے۔ اور نظم ونسق مملکت کے سلسلہ میں جس طرح اور احکام جاری ہوئے ہیں مصلحت وفائدۂ عامہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس اصول پر عمل کیا گیا ہے کہ جو بات شرعاً ممنوع نہیں جائز ہے۔

اس سلسلہ میں سابق ریاست حیدرآباد کے محکمہ امور مذہبی کے نظم ونسق اور انتظام کا ذکر بھی مناسب

سابق ریاست حیدر آباد میں معمول

معلوم ہوتا ہے کہ جس کا مجھے ذاتی علم و تجربہ ہے۔ میں نے وہاں بتیس سال تک منصفی سے لے کر ہائی کورٹ کی ججی تک کام کیا ہے۔ حیدر آباد میں زمانہ مغلیہ سے لے کر دور آصفیہ تک امور مذہبی کی انجام دہی کے لئے معاون یاب قضاۃ مقرر تھے اور یہ سلسلہ موروثی ہوتا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں قاضی خود یہ کام انجام دیتے تھے اور مفصلات اور دیہاتوں میں ان کے نائبین سے یہ فرائض متعلق تھے۔ اگرچہ قانوناً یہ ضروری نہ تھا کہ سرکاری قاضی ہی سے نکاح پڑھوایا جائے تاہم عموماً یہ کام سرکاری قاضیوں ہی سے لیا جاتا تھا۔ نکاح خوانی اور ترتیب نکاح نامہ (جس کو سیاہہ کہتے ہیں) ان کا کام تھا۔ اوّل اوّل اس انتظام میں وہ ساری خرابیاں تھیں جن پر مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور ان کے ہم خیال اصحاب نے روشنی ڈالی ہے۔ مگر کوئی پچاس سال ہوئے صورت حال کی پوری اصلاح عمل میں لائی گئی جب مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی وزیر امور مذہبی مقرر ہوئے۔ انہوں نے تمام خدمات شرعیہ کے لئے تعلیم و تربیت اور امتحان و سند کا طریقہ رائج کیا۔ ایک معیاری نکاحنامہ جو تمام ضروری تفصیلات کا حامل تھا مرتب اور شایع ہوا۔ اس کا رجسٹر ہر قاضی اور اس کے نائبین کے پاس ہوتا۔ جس کی ہر پرت پر نشان سلسلہ اور سرکاری مہر ہوتی۔ بوقت نکاح پانچ کاپیاں اس کی ترتیب دی جاتیں ایک قاری نکاح کے دفتر اور رجسٹر میں رہتی۔ ایک کاپی ڈسٹرکٹ کورٹ کے ریکارڈ آفس کو بھیجی جاتی۔ جہاں ایک رجسٹر میں وصولی کی تاریخ کے لحاظ سے ان کا اندراج ہوتا۔ ایک کاپی ناظم امور مذہبی (ڈائرکٹر) کے دفتر کو ارسال کی جاتی جہاں یہی عمل ہوتا۔ عاقدین نکاح کو بھی ایک ایک کاپی دیدی جاتی۔ اس کا ایک نہایت اچھا اثر ہوا جعل سازی کے مواقع بہت کم ہو گئے۔ اور نزاعات کے تصفیہ میں عدالتوں میں اعلیٰ قسم کی دستاویزی شہادت متعلقہ نکاح و شرایط نکاح کی بہم رسانی نہایت آسان ہو گئی۔ اسی نہج پر آرڈی ننس کے احکام بھی نہایت مفید اور سود مند ہیں۔ اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کمیشن نے کیا تجویز پیش کی تھی اس کی کیوں اور کس حد تک مخالفت کی گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا آرڈی ننس کے دفعہ (۵) میں کوئی خامی تو نہیں رہ گئی ہے۔ جہاں تک کہ علمائے کرام اور مخالفین ریفارم کے اندیشے تھے کہ نکاح خواں سرکاری سے نکاح نہ پڑھوانے اور نکاح نامے کو رجسٹر نہ کرانے سے نکاح ہی غیر شرعی اور ناجائز قرار پا جائیں گے اور اولاد جو ایسے عقد کے بعد پیدا ہو گی صحیح النسب متصور نہ ہو گی۔ رفع ہو گئے ہیں۔ میرے خیال میں حکومت اور ارباب نظم و نسق مملکت کو یہ اختیار ہے کہ جس طرح سینکڑوں دوسرے امور میں گورنمنٹ یا میونسپلٹی کو کسی واقعہ کی اطلاع دینا لازم ہوتا ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں جرمانہ یا کوئی اور سزا مقرر کی جاتی ہے اسی طرح نکاحنامہ کی عدم رجسٹری کو قابل مواخذہ قرار دیدے۔

اس میں قرآن و سنت کے احکام کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ البتہ نکاح نامہ یا سیاہہ کی ایک پرت بجائے کلکٹر ضلع کے اگر ڈسٹرکٹ کورٹ کے ریکارڈ آفس کو ارسال کرنے کا حکم دیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ دار القضا یا عدالت عایلی کے نہ ہونے کی صورت میں اس قسم کے مقدمات جن میں نکاح کا واقعہ اور اس کے شرائط موضِ تحقیق ہوتے ہیں ڈسٹرکٹ کورٹ ہی میں سماعت کئے جاتے ہیں۔ جہاں سے ریکارڈ برآمد کرنا اور نکاح نامہ کی نقل حاصل کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔

علماء کے اعتراض

نئے عایلی قانون کی دفعہ (۵) پر علمائے کرام کی جانب سے تین اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں اول یہ کہ شرعاً عقد میں صرف دو فریق کی ضرورت ہے اور ایجاب و قبول سے نکاح پورا ہو جاتا ہے مگر نئے قانون نے ایک تیسرے فریق کا لزوم بھی پیدا کر دیا ہے۔ مگر اس بحث میں یہ فرض کرنا ہوتا ہے کہ ہونے والے میاں بیوی بوقت انعقاد نکاح صرف دو نفوس سمندر میں کشتی پر سوار ہیں اور اضطراری طور پر بلا انتظار عقد کر لینا چاہتے ہیں۔ یا ایسے ویرانہ میں جہاں کسی تیسرے متنفس کا وجود نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایجاب و قبول سے نکاح قایم ہو جاتا ہے مگر اس کے لئے بھی گواہ کی ضرورت ہے سوائے اس کے کہ عقد اضطراری حالت میں ہو رہا ہو اور گواہ کی بہم رسانی ممکن نہ ہو۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ فی الواقع ہوتا کیا ہے کم از کم میرے علم میں تو کوئی ایسی مثال نہیں۔ ہمیشہ نکاح ایک مجلس میں ہوتا ہے جس میں عاقدین نکاح کے علاوہ رشتہ دار دوست، عزیز سب ہی ہوتے ہیں۔ اور خطبۂ نکاح لازماً پڑھا جاتا ہے جو مسنون بھی ہے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت کی ہوئی ایک مستند حدیث کا حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں حوالہ دے کر خطبۂ نکاح کو جو تشہد اور چند مقررہ آیات قرآنی کی تلاوت پر مشتمل ہوتا ہے ضروری قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام قاری النکاح ہی سے لیا جائے گا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ نکاح جو شرع کی رُو سے صحیح طور پر منعقد ہوئے ہوں رجسٹری نہ کرانے کا ان پر کیا اثر پڑے گا۔ وراثت و نسب کے مسائل تو اس سے متاثر نہ ہو جائیں گے، اس کا جواب صاف ہے۔ نئے قانون نے ان مسائل سے بحث ہی نہیں کی ہے رجسٹری نہ کرانے کا کیا اثر ہوگا ظاہر ہے۔ نہ نسب پر اثر پڑتا ہے اور نہ حق وراثت پر۔ اس لئے شریعت سے کوئی تصادم ہی نہیں ہوتا۔ رہی یہ بات کہ فتنہ پرداز اور غنڈے غلط اطلاعات اور غلط اندراجات کروا کر شرفا کو پریشان کریں گے۔ اول تو پولیس اور قانون تعزیرات ان سے نمٹنے کے لئے موجود ہی ہے پھر چونکہ یونین کونسل کو اس بارے میں اختیارات اور ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ غلط اطلاعات کی توثیق یا تردید ان کے لئے نہایت آسان ہوگی۔ اور ان کے حلقے کے غنڈے بھی ان کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکیں گے۔

میری رائے میں یہ ایک اچھا بندوبست اور اس کی افادیت سے علمائے کرام بھی متفق ہیں۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اسے اختیاری رکھنا چاہتے ہیں۔ میری رائے میں لازمی کر دینے سے افادہ مکمل اور یقینی ہو جائے گا۔ (باقی آئندہ)

بقیہ "لمعات" صفحہ سے آگے

مجمل اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ برہمو سماج نے کہا کہ مختلف مذاہب کی اچھی اچھی باتوں کو یکجا کرنے سے یہ ضابطہ مرتب کیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب ہم، بہ حیثیت مسلمان، یہ بات کہیں گے تو اس سے اس قسم کے مبہم و مجمل تصورات مقصود نہیں ہوں گے۔ اس سے مقصود ہوں گے قرآن کریم کے اصول و قوانین و احکام جن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی

چونکہ یہ اصول و قوانین و احکام، قرآن کریم کے مختلف مقامات میں پھیلے ہوئے ہیں، اس لئے وہ بیک وقت لوگوں کے سامنے نہیں آتے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان ارشادات خداوندی کو مختلف عنوانات کے ماتحت مرتب کر دیا جائے تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ جب ہم "غیر متبدل" اور "قابل تغیر و تبدل" کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں غیر متبدل عنصر سے کیا مراد ہوتی ہے۔ یہ قرآن کریم کی ایک قسم کی (codification) ہو جائے گی جس کی افادیت بالکل واضح ہے۔ یہ کام جس قدر جلد ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

اسلامی معاشرت

روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کیا ہدایت دیتا ہے۔ بچوں۔ عورتوں۔ کم پڑھے لکھے مردوں۔ طالب علموں۔ لڑکوں۔ لڑکیوں۔ سب کے لئے مفید اور کارآمد کتاب

قیمت صرف:۔ دو روپے

ملنے کا پتہ:۔ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

رابطۂ باہمی

(جامع رپورٹ بزمہائے طلوعِ اسلام بابت ماہ جولائی ۱۹۸۱ء)

لاہور بزم کے ماہانہ اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ درس لغات القرآن کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔

ڈیرہ غازی خان بزم کے اجلاس ہر اتوار کو بزم کے دار المطالعہ میں باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ لوگوں کو قرآنی فکر سے روشناس کرانے کے لئے پمفلٹوں کی تقسیم کی جا رہی ہے۔

لائل پور بزم کا ماہانہ اجلاس ۲۰ جولائی کو منعقد ہوا۔ مفہوم القرآن کا ایک پیشگی خریدار بنایا گیا۔

سرگودھا بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ تنظیم نو کے بعد بزم کے ممبران قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں زیادہ مستعدی سے سرگرم عمل ہیں۔ درس لغات القرآن کا سلسلہ بڑی کامیابی سے جاری ہے۔

چک نمبر ۱ شمالی بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ درس لغات القرآن جاری ہے جس میں اراکین بزم بڑی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ طلوعِ اسلام کا لٹریچر پڑھے لکھے احباب تک پہنچایا جا رہا ہے۔

پشاور ہفتہ وار درس قرآن حکیم بذریعہ ٹیپ ریکارڈ جاری ہے علاوہ ازیں مختلف مجالس میں درس قرآن کا ٹیپ سنایا جاتا ہے جس کے نتائج کافی حوصلہ افزا ہیں۔ بزم کی نئے سرے سے تنظیم کی جا رہی ہے۔ پمفلٹ تقسیم کئے جا رہے ہیں۔

کوئٹہ ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں جن میں درس لغات دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان اجتماعات میں ممبران بزم قرآنی فکر کے متعلق مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتے رہتے ہیں۔ بزم نے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے پمفلٹوں کی تقسیم کا وسیع پروگرام بنایا ہے۔

لیہ ماہ جولائی میں بزم کا اجتماع ہوا۔ فیصلہ کے مطابق "طاہرہ کے نام خطوط" اور "اسلامی معاشرت"

کی تین تین جلدیں مقامی زنانہ مدرسہ میں بطور عطیہ بھیجی گئیں۔ ایک رکن بزم نے بارہ کتب لائبریری کے لئے بطور عطیہ کے پیش کش کی ہے۔ لائبریری سے باذوق احباب کو لٹریچر مطالعہ کے لئے دیا جاتا ہے۔ رسالہ طلوع اسلام کے خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس تعداد کو مزید بڑھانے کی کوششیں جاری ہیں۔

چک جھمرہ

بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ مجلس عاملہ سے موصول شدہ پمفلٹوں کی تقسیم جاری ہے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے پمفلٹوں کے علاوہ، لوگوں تک کتب پہنچانے کا پروگرام بھی پیش نظر ہے۔ اس سلسلہ میں "سلیم کے نام خطوط"، "ابلیس و آدم"، "انسان نے کیا سوچا؟" اور "معراج انسانیت" کے لئے میزان پبلیکیشنز کو لکھ دیا گیا ہے۔

چارباغ

بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ اس ماہ دو نئے ممبران کا اضافہ ہوا ہے۔ رسالہ طلوع اسلام کا ایک نیا خریدار بنایا گیا۔ کالونی مل نوشہرہ کی سکول لائبریری کو رسالہ طلوع اسلام کا ایک فائل دیا گیا۔ مختلف مقامات کے علم دوست حضرات کو مطالعہ کے لئے لٹریچر فراہم کیا جا رہا ہے

بورے والا

بزم کے ہفتہ وار اجتماع باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ درس لغات القرآن کا سلسلہ جاری ہے۔ پمفلٹ علم دوست حضرات میں تقسیم کئے جا رہے ہیں۔

کراچی

درس قرآن حکیم بذریعہ ٹیپ ریکارڈ ہر اتوار کی صبح کو نو بجے کرم منزل سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں سنایا جاتا ہے۔ جگہ کے ناکافی ہونے اور حاضری میں روز افزوں اضافے کے پیش نظر اس سے بہتر جگہ حاصل کرنے کے لئے کوشش جاری ہے۔ بزم کے حالیہ اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ رسالہ طلوع اسلام کے خریدار بنانے کی مہم کو تیز تر کیا جائے۔ پمفلٹ کی مناسب تقسیم کے لئے بھی پروگرام بنایا گیا۔

کراچی میں جہانگیر روڈ اور گذری میں سٹڈی سرکل (Study Circle) کی ہفتہ وار میٹنگیں ہو رہی ہیں ان میں قرآن حکیم کی اصطلاحات کا مفہوم لغات القرآن سے پیش کیا جاتا ہے۔ رسالہ طلوع اسلام کے اٹھارہ نئے خریدار اور مفہوم القرآن کے دس نئے پیشگی خریدار بنائے گئے۔ مجلس عاملہ کی یہ تجویز کہ لغات القرآن مختلف لائبریریوں کو بطور عطیہ دی جانی چاہیئے ممبران کے سامنے پیش کی گئی جس کا خیر مقدم کیا گیا۔

مظفر گڑھ

بزم کے ہفتہ وار اجتماعات نمایندہ بزم کے مکان پر باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ علم دوست حضرات کو قرآنی فکر سے متعارف کرانے کے لئے بالمشافہ گفتگو اور لٹریچر دیا جاتا ہے۔ جس سے کافی حوصلہ افزا نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ جناب ڈاکٹر ہر عبدالحق صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی جو کہ طلوع اسلام کی قرآنی فکر سے گہری وابستگی رکھتے ہیں حال ہی میں مظفر گڑھ تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے بزم کی لائبریری کی سرپرستی کا وعدہ فرما لیا ہے۔

بزم کے ایک رکن جمعدار فیض اللہ خاں کی وفات پر ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں مرحوم کی وفات پر گہرے رنج والم کا اظہار کیا گیا اور پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔ بزم کا حلقہ وسیع کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

پنج کسی

ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ لغات کا درس جاری ہے۔ علاوہ ازیں مطالعہ کتب اور تقسیم پمفلٹ حسب معمول ہو رہا ہے۔ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان سے تبادلہ خیالات ہوتا رہتا ہے جس میں موجودہ معاشرہ کی خامیوں کو سامنے لایا جاتا ہے اور پھر ان کا قرآنی حل پیش کیا جاتا ہے جسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مردان

بزم کی میٹنگ ہر ماہ کے پہلے جمعہ کے دن ہوتی ہے۔ درس لغات القرآن جاری ہے۔ درس ہر روز رات کو ایک گھنٹہ جاری رہتا ہے۔ مفہوم القرآن کے نمونے، دیگر پمفلٹ اور طلوع اسلام کے پرچے صاحب ذوق احباب میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ جون اور جولائی میں مفہوم القرآن کے ۲۷ خریدار اور رسالہ طلوع اسلام کے ۸ خریدار بنائے گئے ہیں۔

شکر گڑھ

بزم کا ساتواں اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں احباب بزم کے علاوہ چند معزز مہمان بھی شریک ہوئے۔ مختلف دینی و تاریخی موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ اور اس سے بہت سے الجھے ذہنوں سے ختم ہو گئے۔

کراچی کے دوستو! آؤ اور ہر اتوار کی صبح ۹ بجے کرم منزل (8/A) بالمقابل میونسپل مارکیٹ سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی (بس سٹاپ گورہ قبرستان) تشریف لا کر محترم پرویز صاحب کے الفاظ میں سنئے کہ قرآن عہد حاضر کے چیلنج کا کیا جواب دیتا ہے اور ہمارے مسائل زندگی کا کس قدر نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے۔